www.shibliinternational.com

جولائی 2018

ماہنامہ

صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad



ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

15/- روپے

جولائی ۲۰۱۸ء

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد:۱۔شمارہ:۶

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامؔی

پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی

پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹؔ

محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان

ابوہریرہ (اینکر: نیوز 18) محسن خان

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

قیمت فی شمارہ: 15

سالانہ: 150 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	5
۲	حمد باری تعالیٰ/نعت شریف	کشور سلطانہ	6
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ	ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی	7
۴	قرآنی تعلیمات اور جدید میڈیکل سائنس	ڈاکٹر محمد رفیق قاسمی	11
۵	محمد علی اثر کی شاعری میں فکر وفن کا تنوع	ڈاکٹر نوری خاتون	14
۶	غزل	طلعت پروین	21
۷	عہد وسطی میں تعلیمی سرگرمیاں سرسید کی روشنی میں	آفرین بانو	22
۸	پریم چند کے افسانوں میں ہندستانی تہذیب ومعاشرے کی عکاسی	نغمہ تبسم	27
۹	ڈاکٹر زور کے تدوینی کارنامے	آصفیہ شمیم	32
۱۰	اقبال فہمی	احمد نور عینی	35
۱۱	غزل	ڈاکٹر عبدالحنان رہبر	36
۱۲	غزل	محمد اختر الدین	36
۱۳	اردو کا مستقبل روشن اور تابناک ہے	ادارہ	37
۱۴	حضرت سید مظاہر الدین شاہ چشتی قادری	حکیم سید شاہ خیر الدین قادری صوفی	39
۱۵	فٹ بال فیفا عالمی کپ کا فرانس نیا سکندر	ابو ہریرہ ایوبی	40
۱۶	نغمات کوثر	تبصرہ نگار: ابو ہریرہ یوسفی	41

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

الحاج نواب **حیدر علی**، کنگ کوٹھی حیدرآباد.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغاپورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد..... **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی۔

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔

اداریہ

ماہِ جولائی ۲۰۱۸ء کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ادارہ اپنے معاونین کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، سبھی کے لیے دعا گو اور دعا خواہ بھی ہے۔

ٹیلی ویژن پر دیکھ اور سن کر، اخبارات میں پڑھ کر حیرت ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ اردو زبان بولنے والوں کی تعداد میں کمی آئی ہے، جبکہ ماضی کے شواہد و دلائل بتاتے ہیں کہ اردو روز اول ہی سے ترقی کی طرف گامزن رہی ہے، ملک کی آزادی کے لیے اور ملک کی آزادی کے بعد اردو زبان و ادب نے ملک کی ترقی کے لیے وہ نمایاں کردار ادا کیا ہے کہ جس کی نظیر دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔

آزادی کے بعد ۱۹۷۱ء کی پہلی مردم شماری رپورٹ میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۲/۲ کروڑ چھیاسی لاکھ تھی، دس سال کے بعد ۱۹۸۱ء میں ساڑھے تین کروڑ ہوگئی تھی۔۱۹۹۱ء میں چار کروڑ چالیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔اس صدی کی پہلی مردم شماری یعنی ۲۰۰۱ء میں پانچ کروڑ پندرہ لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔عربی کا ایک مشہور قول ہے۔"مَنْ سَاوَیٰ یَوْمَاہُ فَھُوَ فِیْ الْخُسْرَانْ"۔جس کے دونوں دن برابر ہوں وہ گھاٹے میں ہے۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس کا دن برابر نہ ہو بلکہ نقصان ہو جائے وہ کتنے بڑے خسارے میں ہوگا؟ یہی کچھ حال اردو کے بارے میں ۲۰۱۱ء کی مردم شماری، جس کی رپورٹ تاخیر سے آئی، اس رپورٹ میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے بجائے کمی آگئی، ہمیں اس میں دوسری زبانوں کا موازنہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔اس لیے کہ قومی اور ریاستی سطح پر تقریباً سبھی یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو قائم ہے۔پی جی، ڈگری انٹر کالج اسکول اور مدارس، سرکاری نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں اردو کچھ کم اور کہیں زیادہ شامل نصاب ہے۔الگ الگ ریاستوں کی اردو اکیڈمیاں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور اس کی ذیلی شاخیں سبھی دعویٰ کرتی ہیں اور اپنے کارنامے شمار کرواتے ہوئے گورنمنٹ اور عوام کے سامنے کروڑوں کا بجٹ پیش کرتی ہیں۔آخر کیا وجہ ہوئی کہ اردو کے اعداد و شمار میں نمبر اور مقام گھٹ گیا؟ تنقید نہ کرتے ہوئے بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ لوگ شاخوں پر بھی صحیح پانی نہیں ڈال رہے ہیں بلکہ ادھر ادھر بہا رہے ہیں۔ضرورت ہے بنیاد اور جڑ کو مضبوط بنائیں اور شاخوں پر بھی صحیح پانی ڈالیں، تاکہ اس کی صحیح آبیاری ہو۔ہم امید کرتے ہیں اردو ضرور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرلے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ شماری میں تعصب برتا گیا ہو، تاکہ اردو داں طبقہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے جیسے ہی اعلان کیا کہ دارالقضاء کا قیام ہر شہر اور قصبے میں ہونا چاہئے، یہ بورڈ کا خوش آئند اقدام ہے، اس میں ملک انتظامیہ، عدالت اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے، کیونکہ اس میں وقت اور پیسہ دونوں کی بچت ہے، لیکن اس بات کو سنتے ہی ہندستان کا چوتھا ستون میڈیا نے بغیر سوچے سمجھے ماحول کو بگاڑنے کے لیے ایسا محاذ کھول دیا کہ جیسے ہندستانی عدالت دارالقضاء میں ضم ہوگئی اور مسلمانوں نے اپنی الگ سے عدالت بنالی، حالانکہ انہیں تعصب کی عینک کو اتار کر غیر جانب دار رہتے ہوئے ملک کے کسی دارالقضاء کے سسٹم کو عملی طور پر دیکھنا چاہئے تھا کہ وہاں پر کیا ہوتا ہے۔دارالقضاء میں عام طور پر میاں بیوی کے درمیان اللہ اور رسولؐ کا واسطہ دیتے ہوئے ان کے درمیان بھرپور مصالحت کرانے کی کوشش کرائی جاتی ہے، جب کوئی صورت نہیں نکلتی تو لڑکی کے مجبور کرنے پر مفتیان کرام تبھی خلع، طلاق اور فسخ نکاح کا فیصلہ لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دونوں خاندانوں میں مزید نزاع نہ ہو، اس میں کسی پر زبردستی نہیں کی جاتی ہے، بلکہ قرآن و حدیث کی باتیں ان کے سامنے رکھ دی جاتی ہیں تاکہ ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ہونا تو یہ چاہئے کہ مسلمانوں کی ہر مسجد دارالقضاء ہو، تاکہ ان کے معاشرتی اور سماجی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے میں آسانی پیدا ہو اور یہ طریقہ ملک اور مسلمانوں کے لیے معاون ثابت ہو۔

مشہور کرکٹر ہرجن سنگھ نے کروشیا کو فائنل میں پہنچنے کے بعد یہ ٹویٹ کرتے ہوئے کہا کہ پچاس لاکھ آبادی رکھنے والا ملک فٹبال ورلڈ کپ کا فائنل کھیل رہا ہے اور پوری دنیا کے لیے مرکزِ نگاہ بنا ہوا ہے، جبکہ ہمارے ملک ہندستان کی آبادی ایک ارب پینتیس کروڑ ہونے کے بعد بھی، ہم ہندو اور مسلم کھیل رہے ہیں۔سوچ بدلو، دیش بدلے گا۔یہ مختصر سا جملہ ہندستانی عوام کے لیے لمحۂ فکر کی دعوت دے رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

حمد باری تعالیٰ

یہ کائنات ساری جُھکتی ہے تیرے آگے
دنیا حسین پیاری جھکتی ہے تیرے آگے

شام وسحر کے رنگیں دیکھے جو جلوے تیرے
حیراں نظر ہماری جھکتی ہے تیرے آگے

گم ہوگئے اندھرے روشن ہوئی ہیں راہیں
عاجز جبیں ہماری جھکتی ہے تیرے آگے

تیری عنایتوں کی کوئی بھی حد نہیں ہے
ہر دل کی بے قراری جھکتی ہے تیرے آگے

بخشی ہمیں جو تو نے عقل وخرد کی دولت
ہر دَر کی خاکساری جھکتی ہے تیرے آگے

یہ مہر و ماہ تارے حق کے چراغ سارے
تنویر ان کی نیاری جھکتی ہے تیرے آگے

دنیائے رنگ و بو ہے کشورؔ یہ کہہ رہی ہے
یہ انجمن ہی ساری جھکتی ہے تیرے آگے

نعت شریف

زمیں مہکی، فلک چمکا، ستارے ہوگئے روشن
پلک جھپکی تو دل دھڑکا، نظارے ہوگئے روشن

ضیا برسی، گُہر دمکے، شجر جھومے شرر چمکے
حضورؐ آئے تو دیکھو چاند تارے ہوگئے روشن

نظر پیاسی، جہاں ترسے، زمانہ منتظر کب سے
رسولؐ پاک جب آئے، نظارے ہوگئے روشن

اندھیرے گم ہوئے تاریکیاں بھی چُھپ گئیں ساری
جو نورِ حق ملا ان کو، سہارے ہوگئے روشن

گھٹا برسی تو ہم بھیگے، سراپا چشم نم ہو کر
نوازش ہے نبیؐ کی، دل ہمارے ہوگئے روشن

سمندر تھے سیاہی کے، نبیؐ کا آسرا بھی تھا
ڈبو دیں کشتیاں کشورؔ کنارے ہوگئے روشن

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

حکیم بدرالدین دہلوی

حکیم بدرالدین خان دہلوی (۱۸۴۰۔۱۹۱۳ء) نے امتحان الاطبا لکافتہ الاطبا کا بدرالدجیٰ کے نام سے ترجمہ کیا ہے، جو مئی ۱۹۰۰ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ امتحان الاطبا ۶۸۸ ہجری قبل کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف عبد العزیز بن علی متطیب ہیں۔ اس کا مخطوطہ حکیم بدرالدین دہلوی کو ان کے استاذ حکیم احسن اللہ دہلوی سے ملا تھا اور ناقص الآخر تھا، اس پر سلاطین مغلیہ کی مہریں تھیں گویا یہ مخطوطہ شاہی کتب خانہ میں رہ چکا تھا، اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے اہل علم سے رجوع کیا، ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں اشتہار دیئے مگر دوسرے نسخے کا کہیں سراغ نہ ملا، اس کے بعد ان کی دہلی میں علامہ شبلی سے ملاقات ہوئی اس کی تفصیل انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''اتفاقاً جناب شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی کسی تقریب میں دہلی آئے۔ میں نے ان سے کتاب مذکور کا تذکرہ کیا۔ مولوی صاحب موصوف نے باوجود وسعت نظر اور غیر محدود واقفیت کے کتاب سے اپنی عدم واقفیت ظاہر فرمائی۔ ہاں اس کے ساتھ وعدہ فرمایا اگر کہیں نگاہ پڑی تو ضرور اطلاع دوں گا۔ اس کے چند دن بعد مولوی صاحب کو سفر بیروت ومصر وقسطنطنیہ درپیش ہوا اور وہاں ان کے علم وفضل نے کتاب کی سیر کرائی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ خدیو (مصر) کے کتاب خانے میں انہوں نے دیکھا اور اپنی یادداشت کے لیے کتب خانے کے کمرے اور الماری کتاب نمبر پاکٹ بک میں نوٹ کر لیے۔ جب وہ مع الخیر ہندستان واپس آئے تو یہ نوید مجھے سنائی اور نمبر مجھے بھیج دیئے۔ میں نے ان نمبروں کے ذریعہ مہتمم کتب خانہ خدیو سے تحریرات کا سلسلہ جاری کیا۔ غرض میری یہ سعی بھی مشکور نہ ہوئی، میں نے مکرر شمس العلماء موصوف کو تکلیف دی۔ انہوں نے اپنی علم دوستی واخلاق عمیم سے مزید تکلیف گوارا کر کے اپنے توسط سے میری کتاب مصر بھیجوادی اور مسمی جرجی زیدان کسی اپنے دوست فاضل یورپین کی معرفت کتب خانہ خدیو کے نسخے سے اس گم شدہ اوراق کو بہ احتیاط نقل ومقابلہ معرف احمد ابراھیم کرا کے مجھے چند روز میں واپس منگادی''۔

(امتحان الاطبا لکافتہ الاطبا۔ص:۳۰۶، بحوالہ اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر، ص:۲۰)

اس سے علامہ شبلی کی علم دوستی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے طلبا کی علمی رہنمائی کرتے رہتے تھے بلکہ ملک کے دوسرے اہل قلم کا علمی تعاون کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے۔

نواب بیگم سلطان جہاں

نواب سلطان جہاں بیگم (۱۸۵۸۔۱۹۳۰ء) چوتھی فرمارواے بھوپال مذہب وملت کی خدمت میں خواتین اسلام میں بلند رتبہ حیثیت کی مالک تھیں۔ مذہب، علم وادب اور علما وادباء کی بڑی قدرداں تھی، بڑی نیک اور پاکیزہ مزاج اور باپردہ خاتون تھیں، علامہ شبلی کی انہوں نے بڑی قدردانی کی، علامہ نے سیرت نبویؐ کی تالیف کے لیے جب قوم سے تعاون کا اعلان کیا تو انہوں نے سیرت کے تمام اخراجات کا ذمہ لے کر انہیں سارے آستانوں سے بے نیاز کر دیا تھا، علامہ شبلی نے اسی موقع پر یہ قطعہ کہا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
اسی تالیف وتنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرادل ہے مری جاں ہے
غرض دوہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

۱۸؍نومبر۱۹۱۴ء کو علامہ نے وفات پائی تو بیگم سلطان جہاں نے فرمایا فقیر بے نوا تو چل بسا اب سلطان باقی ہے۔(حیات شبلی،ص:۳۷۵)

علامہ شبلی نے ان سے کئی بار ملاقات کی اور ہر بار ان کے علم وفضل سے متاثر ہوئے۔ایک ملاقات کا انہوں نے بڑا والہانہ ذکر کیا ہے اور آج جب میں نے ان کی متعدد تصنیفات دیکھیں تو میں خود حیرت زدہ رہ گیا کہ حکمرانی کے ساتھ علوم اسلامی اور جدید علوم سے وہ کس درجہ بہرہ ور تھی اور کتنی عمدہ نثر لکھتی تھیں، ان کے قلم سے ایک درجن سے زیادہ بڑی معلومات افزا کتابیں نکلی ہیں۔اختر اقبال، گوہر اقبال بچوں کی پرورش، تربیت اطفال، تذکرہ سلطانی، حیات شاہ جہانی، حیات قدسی، خطبات سلطانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکرہ ہیں۔ایک کتاب عفت المسلمات ہے جو آج بھی پردہ اور عفت وعصمت کے موضوع پر خواتین کے لیے بے حد مفید کتاب ہے۔اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا کہ میں نے اس میں سے اپنی ذاتی رائے کو بہت ہی کم دخل دیا ہے۔قرآن وحدیث کو درج کرنے کے بعد مشاہیر علماء کی جو باتیں ہیں وہ نقل کی ہیں اور پھر انہوں نے قدیم علماء میں شاہ ولی اللہ اور بحرالعلوم اور جدید علماء میں مولانا شبلی اور مولانا نذیر احمد کی رائیں نقل کی ہیں۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

''روشن خیال اور جدید طبقہ میں مولانا شبلی اور مولانا نذیر احمد نہایت ممتاز اور مستند ہیں اور جدید تعلیم یافتہ گروہ میں ان کا تبحر علمی مشہور ہے۔(عفت المسلمات ص ۱-۲)

اس کتاب میں انہوں نے کئی جگہ علامہ شبلی کے اقتباسات اور حوالے دیئے ہیں۔علامہ شبلی نے جب سیرۃ النبی کا آغاز کیا تو علماء کا ایک طبقہ بہت ناراض ہوا اور اس نے شبلی کے خلاف کفر کے فتاوے تیار کر کے بھوپال بھیجے اور کوشش کی کہ بیگم بھوپال تعاون بند کر دیں مگر ایسا نہیں ہوا، اس کا سبب کیا تھا کہیں کس نے لکھا نہیں ہے، لیکن اس کتاب کے دیباچے سے اندازہ ہوا کہ خود بیگم بھوپال بڑی پڑھی لکھی اور روشن خیال تھیں اور وہ علامہ کو بھی روشن خیال اور ان کے تبحر علمی کی قائل تھیں۔ غالباً اسی وجہ سے فتاوے بے اثر رہے۔

بیگم سلطان جہاں کی سیرت اور شبلی سے دلچسپی کا ایک مظہر رسالہ بدءالاسلام کا ترجمہ بھی ہے، جو انہوں نے میمونہ سلطان شاہ بانو سے کرا کے شائع کیا۔وہ خود سیرت پاک پر گہری نظر رکھتی تھیں، انہوں نے لیڈیز کلب بھوپال میں سیرت پر جو خطبات دئے تھے ان کا مجموعہ سیرت مصطفیٰ کے نام سے ۱۹۱۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے دیباچہ سے سیرت نبویؐ اور علامہ شبلی سے ان کے گہرے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''اس ریاست کی ایک صدی سے مذہبی خدمات اور اشاعت علوم دینی میں امتیازی حیثیت رہی ہے اور اس امتیازی حیثیت کو فرماں روا بیگمات نے ہی قائم کیا۔لیکن چونکہ اس زمانہ میں ان تمام مذہبی خدمات میں جو اشاعت علوم سے متعلق ہیں، سیرت نبویؐ کی اشاعت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لیے میں نے اپنے عہد میں اس خدمت کو سب سے مقدم رکھا ہے۔

میں نے میمونہ سلطان شاہ بانو سلمہا سے مولانا شبلی مرحوم کی کتاب بدءالاسلام کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کرایا اور مختصر سوانح عمری بھی لکھوائی جو اسکول کے طالب علموں کو بطور درس کتاب پڑھانی چاہئے۔شاہ بانو سلمہا نے اس کام کو نہایت قابلیت سے انجام دیا اور ذکر

مبارک بہت اچھی کتاب انہوں نے لکھی۔ یہ کتاب متعدد اسلامی مدارس میں بطور نصاب داخل کرلی گئی ہے۔اسی طرح جب میں نے مولانا شبلی مرحوم کی ایک اپیل دیکھی جو سیرت نبویؐ کی تالیف کے متعلق تھی تو مجھے نہایت خوش ہوئی چونکہ میں حضور سرور کائنات کی ایک مستند اور مضبوط سوانح عمری کی ضرورت کو خود محسوس کرتی تھی اور مجھے اطمینا تھا کہ مولانا شبلی مرحوم نہایت قابلیت سے اس کام کو انجام دے سکتے ہیں اس لیے میں نے اس سیرت کی تالیف کے مصارف کی منظوری دے دی، خداشکر ہے کہ اس کی ایک جلد چھپ کر شائع ہوگئی ہے۔ جب تمام جلدیں مکمل ہوکر شائع ہوجائیں گی تو بس اس کو اپنی زندگی کا باعث فخر کام سمجھوں گی''۔(سیرت مصطفیٰ،ص:ب،ج)

مولوی مسعود علی محوی

مولوی مسعود علی محوی (۱۸۶۱۔۱۹۳۵ء) سابق سیشن جج حیدرآباد دکن علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔علی گڑھ سے بی اے کیا تھا، اس وقت علامہ شبلی ایم اے او کالج علی گڑھ میں عربی وفارسی کے پروفیسر تھے۔محوی صاحب فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے اور قاآنی کے طرز میں شاعری کرتے تھے۔۱۳۶۵ھ میں ان کا مجموعہ کلام نذرعقیدت شائع ہوا۔ انہوں نے دیباچہ میں اپنے استاذ علامہ شبلی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔اس دیباچہ سے علامہ شبلی کے طریقہ تدریس کا اندازہ ہوتا، وہ لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ فارسی شاعری علم ابتدا قصیدہ سے ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی نظم نویسی اسی صنف شعر سے شروع کی۔علی گڑھ کالج کی بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے۔مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے،مولانا مرحوم ان نادرالوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دل چسپی پیدا کردینے میں ملکہ رکھتے تھے۔مولانا مرحوم ومغفور کی دلچسپ اور موثر صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قاآنی کا طرز اختیار کیا۔کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے بالکل پاک اور صاف ہوگئے اور بعض فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے،مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہوسکا''۔(نذرعقیدت،ص د:۔شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ)

عبدالرزاق کان پوری

عبدالرزاق کان پوری (۱۸۶۲ - ۱۹۴۸ء) علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ البرامکہ ان کی بڑی مشہور کتاب ہے، اس کو اس قدر مقبولیت ملی کہ مصنف کا نام ہی مولوی البرامکہ پڑگیا،بیگم بھوپال سلطان جہاں بیگم ان کو اسی نام سے یاد کرتی تھیں۔کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کا انتساب علامہ شبلی کے نام ہے اور ان الفاظ میں ہے:

''بکمال ادب وعقیدت، بنابر اظہار شکر یہ تصنیف سلسلہ ہیروز آف اسلام یہ کتاب عالی جناب معلّی القاب شمس العلماء مولانا مولوی شبلی نعمانی پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ وفیلو یونیورسٹی الہ آباد مدظلہم کے نام نامی واسم گرامی سے منسوب کی جاتی ہے''۔

مسند کی از وجودت منبع آداب باد
آستانہ قبلہ جان اولی الالباب باد
خاکسار
مؤلف''

(البرامکہ،ص:۲)

اس انتساب کے متعلق منصف نے اپنی دوسری کتاب بادایام میں سرسید کے حوالہ سے بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ:

''جب پہلی مرتبہ میری کتاب البرامکہ شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ سرسید کو نذر کیا۔ اس وقت سرسید بستر مرگ پر تھے، مولوی وحیدالدین سلیم نے کتاب اور میرا عریضہ پیش کیا، کتاب ہاتھوں میں لے کر چند صفحے پڑھے اور بہت خوش ہوئے اور فرمایا کتاب احتیاط سے رکھو میں ان شاء اللہ اس پر ریویو لکھوں گا، لیکن جب تہدیہ کا صفحہ دیکھا تو فرمایا کہ مصنف نے بڑی غلطی کی ہے، اس کتاب کا تہدیہ مولوی شبلی کے نام کیا گیا، یہ میرا حق تھا، مولوی سلیم نے تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ بہ حیثیت بزرگ قوم اور اردو کے معلم ثانی ہونے کی حیثیت سے ضرور یہ آپ کا حق تھا، یہ سن کر سرسید غصہ ہوئے اور فرمایا تم نے میرا منشا نہیں سمجھا، جب مولوی صاحب نے اصرار کیا تو ارشاد ہوا کہ تم جانتے ہو کہ میں خاندان وزارت سے ہوں میرے نانا دولت مغلیہ میں وزیر تھے اور البرامکہ ایک خاندان وزارت کی تاریخ ہے۔ لہذا میرا حق انتساب شبلی سے زیادہ بدرجہا فائق تھا''۔(یادایام،ص:۳۱۔۳۳)

اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں سوانح نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس کمی کا ذکر ہے کہ اردو میں اس ادب کی بہت کمی ہے اور پھر اس سلسلہ میں علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''نہایت خوشی ہے کہ سب سے پہلے ہمارے محترم واجب التعظیم، شمس العلماء مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی، فیلو یونیورسٹی الہ آباد و پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام (نامور فرمانروایان اسلام) کا لکھنا شروع کیا ہے۔ چنانچہ سلسلہ خلافت سے ''المامون'' یعنی خلیفہ مامون الرشید کی لائف لکھی جو پانچ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس تصنیف سے جو اعتراض علماء پر عدم توجہی تاریخ کا تھا وہ بطور فرض کفایہ کسی قدر ساقط ہو گیا ہے، قوم نے المامون کو قبول کے ہاتھوں میں لیا اور اس کے مضامین کو رغبت کے کانوں سے سنا، اس شرف اور شغف سے پایا جاتا ہے کہ گئی گذری ہوئی حالت میں بھی مسلمانوں کو اپنی قومی تاریخ سے خاص دلچسپی ہے''۔(البرامکہ،ص:۶)

اسی دیباچہ میں علامہ شبلی کا ایک اور جگہ ذکر آیا ہے، علامہ شبلی نے المامون لکھی اور سچ یہ ہے اردو دنیا میں مامون کو زندہ کر دیا، المامون شائع ہوئی تو عباسیوں میں مامون کے انتخاب پر شبلی پر تنقیدیں ہوئیں اور کہا گیا کہ مامون کے بجائے ہارون الرشید اس انتخاب کا مستحق تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی نے اس کے جواب میں لکھا کہ حق یہ ہے کہ اگر اس کا دامن انصاف برامکہ کے خون سے رنگین نہ ہوتا تو ہم اس کا انتخاب کرتے، مولوی عبدالرزاق کان پوری نے اس کا ذکر کیا ہے۔(ص:۱۵) مولانا نے مامون کے انتخاب کے اور بھی اسباب بیان کیے ہیں مگر مولوی عبدالرزاق کان پوری نے ان سے صرف نظر کیا ہے، دراصل وہ اس پر نقد نہیں کر رہے ہیں بلکہ برامکہ کے ذکر سے اردو والوں کی عدم اعتنائی کا شکوہ کیا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ برامکہ کی تاریخ پر مولوی عبدالرزاق کان پوری کی کتاب پہلی مبسوط اور بھرپور کتاب ہے۔

عبد الرزاق کان پوری کی دوسری کتاب ''نظام الملک طوسی'' ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی اس کے دیباچہ میں بھی انہوں نے علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے اور وہ ذکر اس طرح آیا ہے کہ مسلمانوں کو مشاہیر اسلام کے بجائے مشاہیر یورپ سے زیادہ دلچسپی ہوتی جاتی ہے اس کی وجہ وہ اردو میں مشاہیر کی سوانح کی عدم دستیابی بتاتے ہیں، مولانا شبلی نے ندوہ کے کسی اجلاس میں اس امر کا منظوم ذکر کیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف سے رغبت و دلچسپی نہیں رہی۔ چنانچہ مولوی عبدالرزاق کان پوری نے وہ فارسی اشعار بھی نقل کیے ہیں۔(نظام الملک طوسی، ص :۵)

ڈاکٹر محمد رفیق قاسمی
استاد ادب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

قرآنی تعلیمات اور جدید میڈیکل سائنس

سائنس کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ سائنٹیا seientia سے ماخوذ ہے، جس کے معنی علم knowledge کے ہیں اور اصطلاح میں سائنس کے مفہوم ہے۔ تجرباتی علوم حکمت یعنی فطری وطبیعی مظہر کا باقاعدہ علم یا طبیعی حقائق کا وہ علم جو مشاہدے اور تجربے حاصل ہو، جدید سائنس علوم میں ریاض، کیمیا، طبیعات، ارضیات، نباتات، حیوانیات (حیاتیات) فلکیات اور طب سے متعلق علوم شامل ہیں، ہم اس وقت سائنس کے ایک جزء جدید علم طب کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا قرآن سے کس قدر ربط وتعلق ہے اور قرآن میں اس علم سے متعلق کس طرح کے حقائق کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے، علم یعنی نالج وسائنس کا تعلق اسلام اور اس کتاب ہدایت قرآن کریم سے گہرا ہے، قرآن کی وہ آیت جو سب سے پہلے نازل ہوئی علم ہی سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرا وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم (العلق:۱۔۵)

پڑھیں اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپ پڑھیں، آپ کا رب بڑا کرم والا ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، جس نے انسان کو سکھایا، جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں ایسی ہیں کہ ان میں جن حقائق کی طرف آج چودہ سو سال قبل اشارے کیے گئے ہیں، جدید سائنس طویل مسافت طے کرنے کے بعد اب وہاں تک پہنچ پائی ہے اور اس سے قرآن کی حقانیت وصداقت کی توفیق ہوئی ہے، قرآن کو اپنی صداقت ہر استدلال کے لیے سائنس کی ضرورت نہیں، مگر ان جدید انکشافات سے ہمارے ایمان ویقین میں زیادتی اور اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے۔

یہ ممکن نہیں کہ اس کتاب مبین میں ماحولیات، فلکیات، طبیعیات اور دیگر علوم اور اس کے حقائق کی طرف تو واضح اشارہ ہو اور میڈیکل سائنس کی طرف اشارہ نہ ہو۔ قرآن کریم بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جو طبی علوم کے میدان میں معجزانہ حیثیت رکھتی ہیں یا ایسے بے شمار بے مثال نمونے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے کیونکر انسانی علوم ومعارف پر سبقت حاصل کی ہے؟ یہ قرآنی حقائق آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل نازل ہوئے تھے، اس وقت ان کو سمجھنا آسان نہیں تھا، مگر آج طب اور حیاتیاتی علوم میں جدید انکشافات نے اسے سمجھنا آسان بنا دیا ہے گویا قرآن کریم نے جس طرح دوسرے علوم کو موضوع بنایا اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے علم طب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ہمیں غور کرنا چاہئے کہ قرآن کی مجموعی آیات ۶۶۶۶ میں سے احکامات سے متعلق کم وبیش صرف ۵۰۰/ آیات ہیں اور سائنس سے متعلق آیات کی تعداد ۷۵۰/ سے کچھ زائد ہیں اور اس کی تقریباً ایک تہائی میڈیکل سے سائنس سے متعلق ہے۔

میڈیکل سائنس اور عمومی سائنس سے متعلق آیات قرآنی کو کئی اہل علم نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے، جدید میڈیکل سائنس دانوں کے لیے سب سے محیر العقول قرآن کی وہ صراحت ہے جس میں اس نے جنین کے نطفہ، علقہ، مضغہ وغیرہ کے مختلف مراحل سے گزرنے کا تذکرہ کیا ہے۔

جنین کا تذکرہ سائنس کی نظر میں

کچھ دنوں قبل یونیورسٹی یمن کے بانی وچانسلر شیخ زندانی کی سرپرستی میں مسلم میڈیکل سائنس دانوں کے گروپ نے جنین سے متعلق اور دیگر سائنس علوم کے بارے میں قرآنی معلومات جمع کرنے اور انگریزی میں ترجمہ کرنے کے بعد اسے یونیورسٹی آف ٹورنٹو (کنیڈا) میں اناٹومی شعبہ کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر کیتھ لور کے سامنے پیش کیا، جو جنین سائنس کے پروفیسر ہیں اور ان کی رائے طلب کی تو ان کا کہنا تھا کہ جنین سے متعلق آیات قرآنی میں بیان کردہ تمام معلومات جدید سائنس دریافتوں کے عین مطابق ہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعض ایسی بھی آیات ہیں جن کی سائنس کی مطابقت میں صحیح ہے یا غلط، کیونکہ انہیں خود ان آیات میں دی گئی معلومات سے متعلق کچھ علم نہیں، ان کے متعلق جنینات کے جدید مطالعہ اور تحقیقاتی مقاموں میں بھی کچھ موجود نہیں ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے جن حقائق کی نشاندہی کی ہے، ان میں سے بعض تک جدید سائنس ہنوز رسائی حاصل نہیں کرسکتی ہے، مگر اس میں آئندہ جب ترقی ہوگی اور سائنس کا قدم مزید آگے بڑھے گا تو یقیناً یہ سائنسدان ان تمام حقائق کی بھی تصدیق کرنے پر مجبور ہوں گے۔

دوران خون اور دودھ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وان لکم فی الانعام لعبرة نسقیکم مما فی بطونه من بین فرث ودم لبنا خالصا سائغا للشاربین (النحل:٦٦)

تمہارے لیے تو چوپایوں میں بھی بڑی عبرت ہے کہ ہم تمہیں اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے اس میں سے گوبر اور خون کے درمیان خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔

خون کے سرکولیشن کی وضاحت کرنے والے سائنسداں ابن نفیس سے قرآن پاک کا نزول ٦٠٠ رسو سال پہلے اور مغربی سائنسداں ولیم ہاروے سے ایک ہزار سال پہلے ہوا تھا، قرآن نے ان سائنسدانوں کی دریافت سے صدیوں پہلے بتا دیا تھا کہ آنتوں کے اندر ایسا نظام جاری ہے جو نظام ہاضمہ میں انجام پانے والے افعال کے ذریعہ دیگر جسمانی اعضاء کی نشوونما کی ضمانت دیتا ہے، سائنسدانوں نے واضح کیا ہے کہ آنتوں میں کیمیائی عمل (Reactions) جاری رہتا ہے، آنتوں ہی کے ذریعہ ہضم کی ہوئی غذا سے جذب لیے ہوئے مادے ایک پر پیچ نظام سے گزر کر دوران خون میں شامل ہوتے ہیں، کبھی یہ مادے لیور سے گزرتے ہیں، جس کا انحصار ان کی کیمیائی ترکیب پر ہوتا ہے، جن میں دودھ پیدا کرنے والی (پستان) کے غدود بھی شامل ہیں، یعنی آنتوں کی غذا کے کچھ مادے اس کی دیوار سے رس کر خون کی نالیوں میں داخل ہوجاتے ہیں، پھر دوران خون کے ذریعہ کئی اعضا تک پہنچتے ہیں اور چھاتیوں میں دودھ تیار ہوتا ہے، اس کے اندر بے شمار فوائد ہیں، قرآن کی یہ وضاحت عصر حاضر کے میڈیکل سائنس سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور جس افادیت کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے مسلم ہے۔

زیتون اور جدید میڈیکل سائنس

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہدایت میں زیتون کی قسم کھا کر اس کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والتین والزیتون وطور سینین (التین:١-٢)

اس اہمیت وافادیت کے پیش نظر رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کلوا الزیت وادھنوا به فانه من شجرة مبارکة

جدید میڈیکل تحقیقات

١٩٨٦ء تک میڈیکل تحقیقات اور اس سے متعلق کتابوں میں یہی کہا جارہا تھا کہ زیتون کا تیل بلڈ کولسٹرول پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے، نہ اس میں اضافہ کرتا ہے نہ کمی کرتا ہے، مگر جدید ترین تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ زیتون کا بلڈ کولسٹرول کی سطح میں قابل لحاظ حد تک کمی لاتا ہے، مگر اس کمی کے باوجود بلڈ کے لیے مفید وضروری کولسٹرول میں کمی نہیں لاتا، بلکہ اس طرح کے مفید کولسٹرول

میں اضافہ کرتا ہے اور میڈیکل سائنس کی رو سے یہ بات محقق ہے کہ اس قسم کے کولسٹرول میں جتنا اضافہ ہوتا ہے، امراض قلب کا عارضہ (Heart Clo) اتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے۔

زیتون کا تیل اور بلڈ پریشرڈ

بلڈ پریشرڈ کی بیماری دنیا میں عام ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے ۲۰ رفیصد باشندے اس بیماری میں مبتلا ہیں اور اس تناسب میں سال بہ سال اضافہ ہورہا ہے ۹۵ رفیصد حالتوں میں ڈاکٹروں کو اس کی وجہ کا پتا نہیں چل پاتا ہے کہ مریض کن اسباب وجوہات کی وجہ سے اس بیماری میں مبتلا ہے۔ اسٹانفرڈ امریکن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ویلیمز نے بلڈ پریشر کی بیماری میں زیتون کے تیل کی تاثیر وافادیت کا اندازہ کرنے کے لیے ایسے ۷۶ رافراد پر تحقیق وتجربہ کیا جو کسی بھی طرح کی دل کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کے ساتھ میڈیکل سائنس اسکالروں کی پوری ٹیم تھی، تحقیقات کے بعد ان محققین کو پتا چلا کہ جن لوگوں نے زیتون کا تیل استعمال کیا ان کا بلڈ پریشر قابل لحاظ حد تک کم ہوگیا اور جن لوگوں نے اپنی یومیہ غذا کے اندر اسے غذا کا جزء بنایا انہیں بلڈ پریشر سے بڑی راحت مل گئی، خاص طور پر ان لوگوں کو جنہوں نے یومیہ ۴۵ رگرام زیتون کا تیل استعمال کیا۔

خاتمہ

اسلام چونکہ ایک دائمی وابدی مذہب ہے، اس لیے قرآن میں قیامت تک ہر زمانے کی ذہنیت اور اس کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ وہ قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کرسکے اور خدا پرستی وانسانی اقدار کا احیاء کرتا رہے، اس سچے دین کی سچی کتاب میں سائنس اور اس کے متعلقات سے بھرپور تعرض کیا گیا اور لوگوں کو اس میں غور وفکر کرنے، حقائق دریافت کرنے اور نئے نئے نکتوں تک رسائی حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن ہی وہ واحد صحیفہ ہے، جس میں انسان کو کائنات اور اس کے نظام میں غور وفکر کے ذریعہ بصیرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

افلایتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا (محمد:۲۴)

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے مذہبی نصاب میں میڈیکل سائنس سے متعلق آیات قرآنی کو شامل کریں اور قرآن جدید میڈیکل سائنس کے تقابلی مطالعہ کو جزو نصاب بنائیں، اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہر زمانے کی ترقی کے ساتھ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے اور نئے نئے انداز سے اسلام کی خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے متقدمین نے سابق میں بعض ان علوم کی داغ بیل ڈالی جس کے ذریعہ اسلام کے خلاف بپا کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا جاسکا اور نو پید مسائل اور نو پید مسائل کا حل تلاش کیا جاسکا تھا، یہ دور سائنسی ترقی کا دور ہے، اس لیے اسلام ہم سے تقاضہ کرتا ہے اور قرآن ہمیں تاکید کرتا ہے کہ ہم اس میدان میں تاخیر ہی سے سہی قدم رکھیں اور سائنس کے ذریعہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے انسانیت کا رشتہ خالق کائنات سے جوڑنے کی کوشش کریں، مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ سائنس تحقیق میں ہمارا رخ صحیح سمت میں رہے، کیونکہ ہر نو ایجاد شئے کے اندر خیر وشر ہر دو کا پہلو ہوتا ہے، خود انسان کے اندر بھی دو مادے پائے جاتے ہیں، ہمیں اس کے خیر کے پہلو کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہی قرآن کا مطلوب ہے اور شر کے پہلو یا اس کے ذریعہ نظام قدرت میں چھیڑ چھاڑ کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر کوئی بھی چیز نہ تو بے کار پیدا کی ہے اور نا ہی ایسا ہے کہ اس کے اندر توازن کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے اندر توازن رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والارض مددناھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل شیئ موزون (الحجر:۱۹)

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور اس پر اٹل پہاڑ دیئے ہیں اور اس میں ہم نے ہر چیز ایک معین مقدار سے اگا دی ہے۔

ڈاکٹر نوری خاتون
اسسٹنٹ پروفیسر (سی) عثمانیہ یونیورسٹی کالج فار ویمنس

محمد علی اثر کی شاعری میں فکر وفن کا تنوع

پروفیسر محمد علی اثرؔ کا شمار اردو کے ان معدودے چند محققوں میں ہوتا ہے جن کی تخلیقات نے اردو زبان وادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا۔

ماہر دکنیات اور محقق ونقاد کی حیثیت سے انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ رفیق ہوں یا رقیب ہر کوئی ان کی خدمات کا معترف ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے محققین اور نقادوں میں آپ ایک اہم مقام کے حامل ہیں، لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ جتنے بڑے محقق ہیں اتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں تحقیق جیسے خشک موضوع پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے جذبات احساسات، تجربات و خیالات کو شعری سانچے میں ڈھالا۔ ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ مذہبی شاعری پر مبنی ہے۔ یعنی حمد، مناجات، نعت، سلام۔ ان کے حمدیہ ونعتیہ کلام کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ نعتِ رسول خدا (طویل نعت) 2000ء
۲۔ انوارِ خط روشن (مجموعہ حمد ونعت) 2003ء
۳۔ اللہ جل جلالہٗ (مجموعہ حمد ونعت) 2007ء
۴۔ قلم کی سجدہ ریزیاں (حمدیہ ونعتیہ رباعیاں) 2010ء
۵۔ ثنائے حامد ومحمود 2017ء

حمد ونعت اردو شاعری کی ایک موضوعاتی صنف ہے اس کے لیے کوئی خاص ہیئت مقرر و متعین نہیں شاعری کی کسی بھی صنف یا ہیئت میں اس کو برتا جا سکتا ہے۔ یعنی غزل، نظم، مثنوی، رباعی، قطعہ ثلاثی، مخمس، مسدس، ہائیکو، ماہیے، ترائیلے وغیرہ وغیرہ حمد کیلیے اللہ تعالیٰ سے کامل عشق اور جذبے کی صداقت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر انسان دو رکعت نماز نہیں پڑھ سکتا، کوئی بھی نیک کام نہیں کر سکتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی رضا کے بغیر کوئی شخص اس کی حمد وثنا کرے۔ اللہ تعالیٰ یہ اعزاز اپنے ان بندوں کو عطا کرتے ہیں جن کا ظاہر و باطن پاک ہو۔ عام انسان تو صرف ظاہری پاکیزگی کو دیکھتا ہے اور اسی سے متاثر ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ظاہر سے زیادہ باطن کی اہمیت ہے وہ پاکیزہ دل و پاکیزہ دماغ کو ہی اپنی خوشبو سے معطر کرتا ہے۔ محمد علی اثرؔ اللہ رب العزت کے ان خوش نصیب وانعام یافتہ بندوں میں شامل ہیں جن کی زبان سے اللہ سبحان تعالیٰ اپنی تعریف سننا پسند کرتے ہیں۔ آزمائشوں، پریشانیوں اور بیماریوں میں گھرے رہنے کے باوجود بھی جو شخص اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہے تو ایسے مخلص بندے پر اللہ کی عنایت کیوں کر نہ ہو؟ شاید ان کی اسی ادا نے خدا کے دربار میں سرخروئی پائی اور انہیں یہ شرف ملا کہ وہ حمدیہ ونعتیہ شاعری موزوں کرنے لگے۔ اچھی شاعری موزوں کرنے کے لئے اس میں قافیہ پیمائی کے ساتھ ساتھ نغمگی، سلاست، روانی، بہترین الفاظ کا انتخاب، خیال کی ندرت، شوکت الفاظ اور معنی آفرینی کا ہونا بے حد ضروری ہے اس کے بغیر کلام میں دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی اور شاعری صرف الفاظ کا انبار معلوم ہوتی ہے۔ حمدیہ اور نعتیہ شاعری لکھنے کے لیے شاعر کو اور بھی زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہاں صرف محبت کا اظہار معنی نہیں رکھتا بلکہ عقیدت واحترام کا التزام بھی ضروری ہے۔

اثر صاحب کی پہلی نظم ''حمد'' 66 ابیات پر مشتمل ہے جو ''اللہ'' کے اعداد 66 کی مناسب سے نظم کی گئی ہے اس میں محمد علی اثر نے اپنے جدتِ فن کو پرواز دی اور مشکل قافیہ پیمائی کے ساتھ دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی سخت زمین اور قافیہ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مشکل پسندی کا ثبوت دیا مثلاً ممکنات، سومنات، نوازشات، مشکلات، تنزّلات، مسلّمات، تغیّرات، مؤثّرات، مضمّرات، مطالعات، تحفّظات، تنازعات، تفکّرات، محرّکات، کائنات، شکاریات، تحیّرات تصرّفات، جواہرات، دکنیات، مطالبات، لفظیات، وغیرہ وغیرہ اس طویل نظم کی خوبی یہ ہے کہ نہ ہی خیالات بوجھل معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی الفاظ کی تکرار ہوتی ہے بلکہ ہر

شعر معنوی اعتبار سے ندرت لیے ہوئے ہے۔اس نظم کے چند اشعار نمونتاً پیش ہیں:

ہر بات ترے بس میں ممکنات میں ہے
ہماری عقل تو غلطاں تحیّرات میں ہے
وہی مالک بھی ہے،مومن بھی ہے مھیمن بھی
اسی کا سکّہ رواں ساری کائنات میں ہے
تو ہی کریم ہے، رحمان بھی، غفور بھی تو
مرا بھروسہ یقیناً سبھی صفات میں ہے
زمیں سے تابہ فلک تیری جلوہ آرائی
ہماری عقل تو حیراں تجلّیات میں ہے

حمد میں عام طور پر شعراء اللہ تبارک تعالیٰ کے اوصاف بیان کرتے ہیں، مخلوقات پر اس کے احسانات کا اقرار کرتے ہیں اور اس کے خالق، قادر، رحمٰن و رحیم، غفار، ستار اور رزاق، واحد اور ماجد وغیرہ ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

حمدیہ رباعی:

معبود حقیقی کا تو عابد بن جا
وہ حمد کے لائق ہے تو حامد بن جا
مولیٰ ہے وہ، ذوالجلال اعلیٰ، اکبر
وہ واحد و ماجد ہے تو ساجد بن جا

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنے حمدیہ کلام میں اللہ تعالیٰ کے تقریباً تمام مبارک و متبرک اسمائے صفات کا سہارا لے کر التجائیں کیں ہیں، کبریائی ۳ بیان کی ہے وہ اپنی مدح سرائی کو بھی خدا کی دین کہتے ہیں:

اپنے بس کی نہیں ہے حمد و ثنا
رب کی شانِ نزول ہوتی ہے

اثر صاحب کی حمدیہ و مناجاتی شاعری کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

''حمد و مناجات کے میدان میں آپ کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں ان میں بعض اشعار بہت دلکش ہیں خاص کر وہ جن میں سہل ممتنع کا رنگ آ گیا ہے۔'' [۱]

اثر صاحب نے حمد و مناجات کو نہ صرف غزل اور قطعہ کے پیرائے میں پیش کیا ہے بلکہ ماہیے، ترائیلے، ثلاثیاں اور قطعات میں بھی خدائے بزرگ و برتر کی بڑائی و کبریائی کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں ..

ماہیئے (۱) طوفان میں نیّا ہے (۲) معبود ہے تو میرا
پار لگا مولا سر کو جھکاتا ہوں
بس تو ہی کھویّا ہے مسجود ہے تو میرا

ثلاثی تیرا جلوہ ہے چار سو سائیں
پھول میں چاند میں ستاروں میں
ذرّتے ذرّے میں تو ہی سائیں

اثر صاحب کے مندرجہ بالا شعری تجربات پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار سلیم کہتے ہیں:

''ماہیے'' کہنے پر آئے تو ماہیوں کے انبار لگا دیا، ہائیکو، ترائیلے، سانیٹ، ثلاثی وغیرہ وغیرہ نہ جانے کن کن ہیئتوں میں انہوں نے اپنے اشہب قلم کو دوڑایا ہے لیکن ایک بات ہے وہ جس صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں پورے شعور و حساسیت کے ساتھ خود کو شاعری کی تخلیقی فضا میں لے جاتے ہیں'' [۲]

محمد علی اثر نے اپنی حمدیہ و مناجاتی شاعری میں سورۃ فاتحہ کی ٹکنک کو اپنایا ہے یعنی پہلے اپنے خالق کی تعریف و توصیف اس کے بعد اپنی بندگی کا اعتراف اور پھر عز وانکساری کے ساتھ مناجات کا بیان ہے۔ محمد علی اثر کے حمدیہ کلام میں مناجات کا عنصر غالب ہے ان کی بعض حمدوں میں سے دو تین اشعار حمد کے علٰحدہ کر دیئے جائیں تو پوری نظم دعا و مناجات کی صورت میں رہ جاتی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عنایات میں سے ایک ہے کہ بندہ صبح و شام، دن رات، خوشی و غم، تکلیف و راحت ہر ایک موقع پر اپنے خالق کو یاد کرے اسی سے التجا کرے، اسے راضی رکھنے کی کوشش کرے۔ دعا کی اہمیت اس حدیثِ مبارکہ سے بھی واضح ہوتی ہے کہ '' **اَلدُّعاءُ مُخّ الْعِبادَةِ** '(دعا عبادت کا مغز ہے) یعنی جو بندہ جتنی زیادہ دعائیں کرتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ عبادت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کو محبوب رکھتے ہیں جو اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے عاجزی و انکساری سے اس سے طلب کرے۔ محمد علی اثر کی مناجات ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ و خوشبو کے پھول ملیں گے کہیں بے بسی کا اظہار ہے، تو کہیں شکر گزاری، کہیں درد و غم کی انتہا

ہے تو کہیں خوشی کا احساس، کہیں مایوسی اور نا اُمیدی ہے تو کہیں بلند حوصلگی اور پُر اُمیدی ہے۔ غرض انکی اپنی ذاتی زندگی سے جڑے ہوئے واقعات و حادثات کی ترجمانی ہے۔ کہیں وہ اپنی بے بسی، لاچاری، رنج وغم کی انتہا کو پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے ان تکالیف کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے حالات زندگی میں بہتری کی التجا کرتے ہیں۔

غم دیئے ہیں جب اتنے اے مالک
مجھ کو طاقت بھی صبر کی دے دے
دل کی دھڑکن بھی تو مولا اب سنی جاتی نہیں
تو نے سناٹا لکھا میری سماعت کے لیے
درد سہنا بھی اثر اس نے سکھایا مجھ کو
لکھ کے خود درد بھرا میرا مقدر اس نے
چلتا رہوں اوروں کا سہارا لے کر کب تک
اپنے پیروں پر چلنے کے قابل کر دے
یا الٰہی دعا مری سن لے
آس میری ملول ہوتی ہے

حمدیہ رباعی:

خود ہی میں مگن رہنا ہے عادت میری
اپنوں کو بلا لاتی ہے چاہت میری
حجرے میں ہوں میں مثل مزار، اے اللہ!
بس اتنی سی ہے گھر میں ضرورت میری

محمد علی اثر نے اللہ تعالیٰ سے نہ صرف اپنی تکالیف کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کی بے پناہ نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی رضا میں راضی رہنے والے اشعار بھی قلمبند کئے ہیں جس سے ان کی سعادت مندی اور عبدیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے اشعار کے مطالعہ سے غمگین وملول قاری بھی مایوسی کی اتاہ گہرائیوں سے نکل کر امید کا دامن تھام لیتا ہے۔

تیری یہ خُو کہ مسلسل نوازشات میں ہے
یہ بندہ پھر بھی سمجھتا ہے مشکلات میں ہے

کفر ہے اے اثر یہ مایوسی
لطف اس کا تجھی پہ سارا ہے
اس میں بھی مصلحت یقیناً ہے
جن دعاؤں کو ٹال دیتا ہے
دیا ہے ہم کو طلب سے بھی کچھ سوا لیکن
ہماری خوئے گدائی مطالبات میں ہے

محمد علی اثر کے پاس رنج وغم تکالیف اور ظلمتوں سے مایوس نہ ہونے اور خدا کی رحمتوں سے ہمیشہ پُر امید رہنے کا درس بھی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

تکلیف بھی راحت کا سبب ہوتی ہے
ہاں! ویسے مگر صبر طلب ہوتی ہے
اللہ نے رکھا ہے ہر اک کام کا وقت
عجلت تو اثرؔ! سوئے ادب ہوتی ہے
تنویر قمر دیکھ کے خوش ہوجاؤ
گرمی میں شجر دیکھ کے خوش ہوجاؤ
اللہ سے مایوس کبھی مت ہونا
آثارِ سحر دیکھ کر خوش ہوجاؤ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے بعد فرمایا کہ یہ تو خطا کا پتلا ہے غلطیاں اور لغزش اس سے ہمیشہ سرزد ہوتی رہیں گی۔ لیکن مومن وہی ہے جسے اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ اس پر شرمندہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو جو نعمتیں انسان کو ودیعت کی ہیں ان میں سب سے اہم نعمت اپنے گناہوں کا احساس ہے۔ رابعہ بصریؒ سے کسی شخص نے پوچھا کیا گناہ گار کی توبہ قبول ہوتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جب اسے توبہ کی توفیق مل گئی تو توبہ قبول ہونا بھی بعید نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس انسان سے محبت کرتے ہیں اسے گناہوں سے بچا کر رکھتے ہیں یا کبھی اس سے کوئی خطا سرزد ہوجائے جو کہ اس کی فطرت میں شامل ہے تو جلد ہی اسے اس کی غلطی کا احساس کرادیتے ہیں الحمد اللہ یہ خوبی بھی اثر صاحب کے کلام میں موجود ہے اسی لیے لکھتے ہیں:

کوئی لغزش جو ہو اثرؔ ہم سے
عرقِ انفعال دیتا ہے
رو رہا ہوں خطاؤں پر اپنی

آنکھ میں آنسوؤں کا دھارا ہے

ضمیر بن کر جو چبھتا ہے ہر برائی پر
ہمارے سینے کے اندر وہ خارتیرا ہے
ضمیر بن کے بدی سے جو روکتا ہے مجھے
مرے وجود میں پاسباں اس کا ہے

محمد علی اثر نے اپنے کلام میں جابجا اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کی ہے اپنے گناہ گار ہونے کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ستار العیوب، وغفار الذنوب ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے کہتے ہیں:

میری خطاؤں کو یا رب تو درگزر فرما
غفور، عفو وکرم بھی تری صفات میں ہے
ہے تیری شانِ کریمی معاف کردینا
فروگزاشت تو انسان کی صفات میں ہے

محمد علی اثر کا طرز زندگی نہایت سادہ ہے وہ دنیاوی عیش وآرام، آرائش وزیبائش کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ دنیا کو ایک دھوکہ قرار دے کر اس کے فریب میں نہ آنے کا مشورہ دیتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ دنیا ہیچ ہے جو شخص آخرت میں کامیاب وکامران ہوگا وہی حقیقت میں سرفراز ہوگا اس لیے وہ خاتمہ بالخیر کی دعا کرتے ہیں:

دنیا تو ہے پیروں میں اک دام، اثرؔ
جو نشہ بڑھا دیتا ہے وہ جام اثرؔ
عقبیٰ کی بھلائی کے بھی ساماں کرو
ہو خاتمہ بالخیر تو آرام اثرؔ

حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جو شخص اپنے اہلِ خانہ کے لیے حلال روزی کماتا ہے تو گویا وہ بھی خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے محمد علی اثر کے یہاں بھی ہم کو بار بار حلال و پاکیزہ کمائی کا ذکر ملتا ہے، اس بات پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ اس نے ہی انہیں یہ توفیق دی کہ وہ اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے لئے حلال رزق کا بندوبست کرے۔

یہ کرم ہے ترا کہ تو مولا
مجھ کو رزقِ حلال دیتا ہے
زرو جواہر مال و دولت سب اس کے
میری کمائی میں بھی برکت اس کی ہے

ترے رستے پہ چلتا ہوں بُرائی سے میں بچتا ہوں
مجھے تو صرف محنت کی کمائی دے مرے اللہ

حلال رزق کے ساتھ محمد علی اثر نے اپنے پیشۂ تدریس سے جڑے رہنے کا بھی بارہا ذکر کیا ہے۔ پہلے وہ خود علم کی دولت سے مالا مال ہوئے اور پھر اس گراں مایہ سرمائے کو اپنے شاگردوں میں لٹانے لگے۔ نہایت ہی شفیق ومہربان استاد کی حیثیت سے وہ اپنے شاگردوں میں ممتاز ہیں۔ آپ کے پُرخلوص رویّے کا معترف آپ کا ہر شاگرد ہے۔ استاد کا ہمدرد اور غم خوار ہونا اور ساتھ ہی ساتھ بحر العلوم بھی ہونا شاگردوں کے لیے سونے پہ سہاگے کا کام کرتا ہے۔ اور خود اثر صاحب کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ رب کریم نے جب انہیں معلم کے منصب پر فائز کیا ہے تو طالب علم کی طلب کو پورا کرنا ان کے فرائض منصبی میں شامل ہوگیا اس لیے وہ کہتے ہیں:

پڑھنے کے لیے اور پڑھانے کے لیے
نیکی پہ سدا چلنے چلانے کے لیے
رب نے ہمیں تعلیم کی خاطر بھیجا
کم علم کو ذی علم بنانے کے لیے
ہر پیاسے کی پیاس بجھانا سیکھا
ہم نے تو یہی پینا پلانا سیکھا
ہم کو جب بنایا ہے معلم رب نے
بس علم کی دولت کو لٹانا سیکھا

ڈاکٹر محمد علی اثر اپنی ساری صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی نذر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اللہ کا کرم نہ ہوتا تو میری زبان سے اس کا ذکر جاری نہ ہوتا اور اس پاک ورد کی بدولت ہی دنیا میں مجھے اعزازت، انعامات، کمالات حاصل ہوئے ہیں۔ یہ اللہ رب العزت کی شان کریمی ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے کہتے ہیں:

الٰہی ذکر میں تیرے اگر شاغل نہیں ہوتا

کسی خوبی کا میں ہرگز کبھی حامل نہیں ہوتا
کوئی قابل نہیں ہوتا، کوئی عاقل نہیں ہوتا
بغیراز بندگی ہرگزسکوں حاصل نہیں ہوتا
جس کو چاہے علم وفن کی آگہی دیتا ہے تو
چاہنے والوں کو اپنے برتری دیتا ہے تو

ایک بڑا فنکار اپنی تحریروں وکلام کوصرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے جو یہ کمال اسے ودیعت کیا ہے اس میں سماج کا حصّہ ہے اس لیے وہ اپنے اطراف واکناف، قریب وجوار پر عمیق نظر رکھتا ہے اور اپنے کلام کا ایک معتد بہ حصّہ ان کے لئے مختص کرتا ہے۔ڈاکٹر محمد علی اثر صاحب چونکہ چلنے پھرنے سے قاصر ہیں اس لیے وہ اخبارات کے مطالعے اور ٹیلی ویژن کے مشاہدے کے ذریعہ ملک و بیرون ملک کے حالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔اخبارات کا مطالعہ بھی وہ اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا تحقیقی، علمی اور ادبی کتابوں کا۔اخبارات کے مطالعے سے وہ ملک و بیرون ملک کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی حالات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور ہلاکت و ذلت پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اور اسی غم میں ڈوبے ہوئے وہ خدا کے حضور دستِ دعا دراز کرتے ہیں:

ہراس وخوف و تشدد ہے جس طرف دیکھو
ترے حبیبؐ کی امت تفکرات میں ہے
توہم کو اپنے تحفظ کی ڈھال دے مولا
عدو کا آج مسلماں پہ وار ہے اللہ
فوج اصحابِ فیل آئی ہے
چونچ میں طائروں کی کنکر دے
رقص جاری ہے ضلالت کا یہاں پرائے اللہ
ہوگیا مشکل بچانا جان کو ایمان کو

رباعی: مظلوم ہوئے جاتے ہیں مصلوب یہاں
بے جرم ہوئے جاتے ہیں معتوب یہاں
اب تو ہی اے اللہ! محافظ ہے ان کا
معصوم ہوئے جاتے ہیں مغضوب یہاں

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنی شاعری سے اصلاحِ معاشرہ کا کام بھی لیا ہے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے ذرائع بھی بتائے ہیں۔

رباعی:
اللہ کے بندوں کا سہارا بن جا
اس دور کی ظلمت میں اجالا بن جا
ہے قرب الٰہی کی جو خواہش تو اثر
بندوں کے ہر اک غم کا مداوا بن جا

ڈاکٹر محمد علی اثر کے یہاں حمد ومناجات کے علاوہ نعت کا بھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔صوفیاء کرام نے تصوف کی رو سے عشقِ حقیقی کے ۳؍مدارج مقرر کیے ان میں سب سے پہلا فنافی الشیخ، دوسرا فنافی الرسول اور تیسرا فنافی اللہ ہے۔اللہ تعالیٰ کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کا بہتر اور کارگر طریقہ اس کے محبوبِ خاص یعنی حضور اکرم ﷺ کی محبت اپنے دل میں پیدا کرنا ہے۔آپؐ سے محبت ایمان کا جزو ہے۔آپؐ کے اوصاف حمیدہ کو اپنانا آپؐ کے طریقہ کار پر چلنا، آپؐ پر درود وسلام بھیجنا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔اثر صاحب نے ایک طویل اور یادگار نعت ''نعتِ رسولؐ خدا'' کے نام سے نظم کی ہے اس نعت پاک کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اشعار کی تعداد اسمِ مبارک ''محمدؐ'' کے اعداد کے برابر ہے۔92 اشعار پر مشتمل اس طویل نعت کی خصوصیت اس کی روانی، شگفتگی اور تسلسل میں مضمر ہے طویل اور مترنّم بحر کی اس نعت شریف کے بیشتر اشعار مرصع ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تمہیںؐ ہو ہر اک جہاں کے سرور، درودتمؐ پر سلام تمؐ پر
تمہیںؐ ہو آقا شفیعِ محشر، درودتمؐ پر سلام تمؐ پر
تمہارؐی خاطر بنی یہ دنیا، تمہارؐے دم سے ہے بزم عقبیٰ
ہر ایک منظر تمہارؐا منظر، درود تمؐ پر سلام تمؐ پر

حضور اقدس ﷺ کی ذاتِ مبارک ایسی بابرکت اور متبرک ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اور فرشتے آپؐ پر درود وسلام بھیجتے ہیں اور انبیاء ومرسلین میں آپؐ ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپؐ کا اسمِ مبارک لینے اور آپؐ پر درود پڑھنے سے انسان کے 10 گناہ معاف ہوتے ہیں، 10 نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور 10 درجات بلند ہوتے ہیں۔

تمہاؐرا پیکر ہے نورِ اوّل، تمہیں ؐ ہو نبیوں میں سب سے افضل
تمہاؐرا ثانی نہ کوئی ہمسر ،درود تمؐ پر سلام تمؐ پر

قدیم دور میں جو نعتیں لکھی جاتی تھیں ان میں زیادہ تر آپؐ کے ظاہری خدوخال کو واضح کیا جاتا تھا آپؐ کے حسن و جمال، لب و رخسار، چشم و ابرو، زلف عنبریں وغیرہ کا ذکر ہوتا تھا۔ یعنی سراپا نگاری تک ہی نعت گوئی کو محدود رکھا گیا تھا۔ 1857ء یعنی ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے بعد جس طرح زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں آئیں اسی طرح ادب میں بھی تغیرات رونما ہوئے اب ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کو فروغ حاصل ہوا۔ یعنی ادب میں معاشرے کی بھی عکاسی کی گئی اور ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرہ کا کام بھی لیا جانے لگا جس طرح نثر اور شاعری کی تمام اصناف میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اسی طرح نعت گوئی کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی۔ اب صرف سراپا نگاری پر ہی شاعر اکتفا نہیں کرنے لگا بلکہ آپؐ کے اوصافِ حمیدہ، آپؐ کی سیرت و کردار، انداز و اطوار، لب و لہجہ، جود و سخا، حلم و حیا، رحم و کرم کی تشہیر بے انتہا ضروری تھی جس کے بیان کا مقصد انسان کی اصلاح تھا۔ وہ محبوب کبریاؐ کے ان صفات سے واقف ہو کر ان کو اپنی زندگی میں شامل کریں تا کہ دنیا و آخرت سنور جائے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کی نعتوں میں یہ دونوں عنصر ملتے ہیں چند اشعار دیکھیے:

سراپائے مبارک بدن تمہاؐرا ہے نورِ پیکر، تو رشکِ یوسفؑ ہے روئے انوؐر
تمہاری زلفیں ہیں مشک و عنبر، درود تمؐ پر سلام تمؐ پر

سیرت مبارکہ:

تمہارےؐ جود و سخا مثالی، تمہاؐرے لطف و عطا مثالی
تمہاؐرا منہاج سب سے بہتر، درود تمؐ پر سلام تمؐ پر
تمہاؐرے صدق و صفا مثالی، تمہاؐرے حلم و حیا مثالی
تمہیں ہو رحم و کرم میں اشہر، درود تمؐ پر سلام تمؐ پر

حضور ﷺ کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین میں آپؐ نے اپنی زندگی میں جنت و دوزخ کی سیر کی اور اللہ تعالیٰ کے دیدار سے شرف یاب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بلندیوں کی معراج تک پہنچا دیا۔

کیا شان ہے، عظمت ہے، مرے آقاؐ کی
کیا حشمت و شوکت ہے مرے آقاؐ کی
معراج کی شب رب نے بنایا مہمان
کیا رفعت و عزت ہے مرے آقاؐ کی

محمد علی اثر نے نہ صرف غزلیات و رباعیات میں بلکہ جدید صنفِ شاعری ماہیے میں بھی آپ ﷺ کی مدحت بیان کی ہے۔

۱۔ وہ شافع محشر ہیں
۲۔ مایوس نہیں بندہ
پاک نبیؐ میرے نام ترا مولا
بخشش کا سمندر ہیں ہے دل پہ میرے کندہ
۳۔ جنگل ہو کہ صحرا ہو
۴۔ وہؐ دین کے رہبر ہیں
راج فقط تیرا نور کا دریا بھی
دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو طاہر ہیں مطہر ہیں

محمد علی اثر کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے دل میں حضور ﷺ کی محبت پیدا کرتا ہے اسے یقیناً اللہ تعالیٰ کا قرب و چاہت نصیب ہوتی ہے۔

جس میں حبِ رسول ہے اس کو
رب کی چاہت وصول ہوتی ہے

اثر صاحب کی نعتیہ شاعری کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر راہی فدائی صاحب نے آپ کی شخصیت کی بھی عکاسی کی ہے کہتے ہیں:

''درود و سلام پر مشتمل اس نعتیہ نظم کو پڑھتے ہوئے بے اختیار چشم بینا سے اشک ہائے عقیدت رواں ہو جاتے ہیں اور دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ڈاکٹر اثر کا سینہ یقیناً یقیناً عشقِ رسول اکرم ﷺ سے معمور و ضیا بار ہے، ورنہ ایسی اثر آفرینی جو قلب و نظر کو معطر و منوّر کر دے اور ایسی کیفیت جو دل و دماغ کو یک گونہ تقدس و ترفع سے ہمکنار کرے کسی سطحی اور کھوکھلی تخلیق سے عیاں ہو، یہ ناممکن و محال ہے''

محمد علی اثر نے اپنے کلام کو قرآنی آیات کی مطہر و معطر خوشبو سے بھی مہکایا ہے اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ نثر کی بہ نسبت شاعری لوگوں کو

زیادہ متاثر کرتی ہے اشعار کے سانچے میں مذہبی و دینی پیغام لوگوں میں جوش پیدا کرتا ہے اس لیے تو الطاف حسین حالؔی نے ''مدوجزر اسلام'' لکھ کر اس دور کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا تھا۔ علامہ اقبال کی شاعری نے تو سارے عالمِ اسلام میں نئی روح پھونک دی تھی۔ غرض شعراء نے قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ کو بھی شعر کا جامہ پہنا کر ہر خاص و عام کے لئے اس کا سمجھنا سہل کر دیا محمد علی اثرؔ کی شاعری میں بھی یہ رنگ و آہنگ ملتا ہے ذیل میں چند قرآنی آیات اور ان کا منظوم ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دیکھیے...

۱. اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم. صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآ لِّیْنَ . آمین

پیدا کیا احسان ترا، یا اللہ
مجھ کو تو دکھا دے ان کی سیدھی راہ
انعام دیا جن لوگوں کو تونے
مغضوبوں کے رستے سے بخش پناہ

۲۔ اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَال.

جمیل بھی ہے محبّ جمال بھی تو ہے
یہ تیرے حسن کا پرتو ہی کائنات میں ہے

۳. کلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَام

موجود اس کی ذات ہے اور سارے ذی حیات
ہیں صورت بقاء میں فنا سے جڑے ہوئے
تیری مخلوق سب فنا ہوگی
دائمی صرف ذات تیری ہے

۴۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَۃِاللّٰہِ

کفر ہے اے اثر یہ مایوسی
لطف اس کا تجھی پہ سارا ہے

۵۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ

ترے فرشتے بھی ان پر درود پڑھتے ہیں
مرے نبیؐ کو پہنچتا سلام تیرا ہے

۶۔ یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمٰاتِ اِلَا النُّوْرِ

قدم قدم پر منور کیے اسی نے چراغ
ہر ایک گام پہ تھیں ورنہ ظلمتیں کیا کیا

۷۔ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یا اَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْ اصَلُّوْعَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْ تَسْلِیْمَا

خدا، فرشتے، حضورؐ پر صلوٰۃ و تسلیم بھیجتے ہیں
یہ حکم ہم کو بھی ہے سراسر، درود تمؐ پر سلام تمؐ پر

۸۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جب کام نیا کرنا
نام سے اللہ کے
آغاز کیا کرنا

دیگر شعراء کی طرح اثرؔ صاحب کو بھی یہ خواہش ہے کہ ان کا کلام مقبول خاص و عام ہو اسی لیے وہ بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہیں کہ ان کے لہجے کی پذیرائی ہو، قلم میں روانی ہو، تحریر میں اخلاص اور تقریر میں صداقت ہو۔ اشعار ملاحظہ ہوں...

مرے شعروں میں جان آئے، میری پہچان بن جائے
مرے لہجے میں کچھ ایسی سمائی دے مرے اللہ
پھر رواں ہو مرا قلم ربی
میرا قائم رہے بھرم ربی
بخش دے لہجے میں تازگی
اور شعروں کو عطا کر زندگی
عطا ہو ژرف نگاہی کا کچھ ہنر مولا
ترے کرم سے مراد وق دکنیات میں ہے
ہاتھ میں تیرے ہیں میری وسعتیں
میں ہوں نقطہ اور تو پرکار ہے

دعاء و عرض داشت کے علاوہ محمد علی اثر کے کلام میں تعلّی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ اپنے اخلاق و عادات و

خیالات سے آگہی کے بعد اس کی تشہیر ہے اِس بات پر بھی وہ اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے کہ اشعار میں جو حسن ادا ہے، اور تحقیق میں جو کمال ہے سب اسی کا ہے۔

اللہ کا ہے فضل اسی کی یہ دین ہے
ہیں شعر میرے حسنِ ادا سے جڑے ہوئے
میری تحقیق دین ہے تیری
شعر میں بھی کمال تیرا ہے

رباعی:

تصویر وفا اور محبت ہیں ہم
اخلاص کے پیکر ہیں، مروت ہیں ہم
اللہ سے ڈرتے ہیں، بہرحال سنو
اس دور کی لازمی ضرورت ہیں ہم

محمد علی اثر صاحب کی حمدیہ و مناجاتی شاعری کے بغور مطالعہ کے بعد علقمہ شبلی یہ کہتے ہیں...

''حمدیہ مجموعے کم شائع ہوئے ہیں آپ جیسے عالم، شاعر اور دانشور کی اس طرف پیش کرتے ہیں
مسرت خیز ہے آپ کو فن پر دسترس حاصل ہے اور شاعری کے رموز پر بھی آپ کی نگاہ ہے۔'' [۴]

الغرض محمد علی اثر کی مذہبی شاعری میں ان کی پوری زندگی کا عکس واضح ہے۔ کہیں وہ اپنے والد اور والدہ کا ذکر ان کے اسمِ گرامی کے ساتھ کرتے ہیں تو کہیں اپنی اولاد کی تفصیل پیش کرتے ہیں کہیں اپنی بے بسی و لاچاری کا اظہار ہے تو کہیں اپنے نام اور کلام کی شہرت پر شکر گزاری۔ انہوں نے زیادہ تر حمد و نعت میں مختصر مگر مترنم بحور کا استعمال کیا ہے۔ اندازِ بیاں صاف و سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔ اشعار میں روانی اور بے ساختگی ہے جو ان کے کلام کو دلکش اور ہر دل عزیز بناتی ہے۔

حوالے و حواشی

[۱] ڈاکٹر راحت سلطانہ ''محمد علی اثر کی حمدیہ و نعتیہ شاعری'' ص 10
[۲] ڈاکٹر راحت سلطانہ ''محمد علی اثر کی حمدیہ و نعتیہ شاعری'' ص 127,126
[۳] ڈاکٹر راحت سلطانہ ''محمد علی اثر کی حمدیہ و نعتیہ شاعری'' ص 12
[۴] ڈاکٹر راحت سلطانہ ''محمد علی اثر کی حمدیہ و نعتیہ شاعری'' ص 11,10

طلعت پروین۔ دریاپور، پٹنہ

غزل

اپنے اندر ہی کسی اور کو بستا دیکھا
اپنے چہرے میں نئے درد کا چہرا دیکھا

تیری آنکھوں نے بیاباں کو دیکھا بھی گلشن
میں نے ہر باغ کو جلتا ہوا صحرا دیکھا

لوگ کہتے ہیں اسی شخص کو پتھر دل سب
جس کی آنکھوں میں پگھلتا ہوا دریا دیکھا

وقت لایا ہے وہ منزل پہ غموں کی مجھ کو
اپنا سایہ بھی کہیں دور ہی ٹھہرا دیکھا

آج سے ختم ہوئی بزم محبت اے دل
جس کو آنا تھا یہاں آسکا جنازہ دیکھا

مجھ پہ ڈھائے گئے ظلموں کا نشاں ہی نہ ملا
حشر میں نامہ اعمال جو اپنا دیکھا

ایسا اک دن بھی نہ گزرا کبھی طلعت مجھ پر
اُن کی بانہوں کو مرے واسطے مہکا دیکھا

آفرین بانو
ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عہد وسطیٰ میں تعلیمی سرگرمیاں- سرسید کی روشنی میں

اصل میں تعلیم کیا ہے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے جس کے بارے میں لوگوں کے خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک فلسفی اس کے معنی اپنے نظریات کے مطابق لیتا ہے تو ایک سائنس داں اپنے نظریہ کے مطابق۔ اس طرح ایک استاد اس کے معنی اپنے صلاحیت کے مطابق دوسرا معنی اخذ کرتا ہے۔ اور ایک تاجر اس کو دوسرا معنی پر محمول کرتا ہے۔ دراصل ان کے خیالات میں خود ان کا نظریہ زندگی میں چھلکتا ہے اس لیے قبل اس کے ہم تعلیم کی مختلف تعریفوں پر بحث کریں۔ یہ ضروری ہے کہ تعلیم کے لغوی معنی پر غور کریں۔ لفظ تعلیم یا ایک لاطینی لفظ (Educere) سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی پرورش کرنا ہے۔ اس مناسبت سے اس کا مطلب پرورش کرنا اور بچّے کو دماغی، جسمانی اور اخلاقی تربیت دینا ہے۔ یہ مفہوم لفظ تعلیم سے ادا نہیں ہوتا کیوں کہ تعلیم لفظ علم سے نکلا ہے جس کے معنی علم حاصل کرنا یا علم کے حصول میں مدد دینا ہے۔ مگر دراصل تعلیم سے مراد صرف علم حاصل کرنا یا علم کے حصول میں مدد دینا ہی نہیں بلکہ تربیت دینا بھی شامل ہے تعلیم کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ تعلیم دراصل انسان کی اس کے ماحول سے ہم آہنگی اور ماحول کی نئی تشکیل کا نام ہے جس کے ذریعے فرد اور معاشرے دونوں کو فائدہ پہنچے۔ ایک اور نظریہ کے مطابق تعلیم وہ عمل ہے جس سے بچوں کی مربوط اور متوازن بڑھوار قائم رکھی جاتی ہے تاکہ بچہ بڑا ہو کر ایک متوازن اور مربوط شخصیت کا مالک بن سکے۔

یہ ہوا تیرے موافق خود بخود ہوجائے گی
لاعلوم نو کا عصری آگہی کا آئینہ لے[1]

افراد، ملت اور قوم کے بنانے سنوارنے کا سب سے اہم اور بنیادی ذریعہ تعلیم ہوتی ہے اس لیے اقوام وملل کے عروج وزوال کا تعلق براہ راست تعلیم سے جُڑا ہوتا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ ہی زوال وپس ماندگی سے نجات پائی جاسکتی ہے اور تعلیم کے ذریعے ہی بامِ عروج تک پہنچا جاسکتا ہے۔ کامرانی وفتح مندی اور جس تعلیم میں تغیر وتبدل عمل، نئی جہتوں کی تلاش اور نئی دریافتوں کی کوشش اور روانی وبہاؤ کی کیفیت نہیں ہوتی وہ تعلیم ٹھہرے ہوئے اس پانی کی طرح ہے جو جلد ہی سڑ جاتا ہے اور مختلف بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بننے والا ہے اس لیے نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم لچک دار اور اصلاح وتغیر پسند ہونا چاہیے تاکہ تبدیلی واصلاح کا عمل بتدریج جاری رہے۔

عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیاں غزنوی دور سے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ اس میں عربی علوم وفنون کے علاوہ فارسی زبان وادب کے داخلے کا آغاز بھی اسی دور میں مانا جاتا ہے مگر اس زبان وادب کو ترقی شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والی مسلم حکومتوں کے ذریعے حاصل ہوئی۔ مملوک، البری، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل کے علاوہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں قائم ہوئیں۔ چھوٹی بڑی سلطنتوں نے فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ہندوستان میں فارسی ادب کے ہر میدان میں مثلاً تاریخ، لغت، تذکرہ، تفسیر، تراجم، نیز یہ کہ ہر علوم وفنون پر کئی کئی تصانیف لکھی گئیں۔ مگر سب سے زیادہ جس میدان میں ترقی ہوئی وہ شاعری کا میدان تھا اور اس شاعری میں جس طرح اور جس خوبی سے استعارہ، تشبیہ، حسنِ تعلیل، مراۃ النظیر اور تلمیح کا استعمال ہوا ہے دوسری زبانوں میں اتنی برجستگی اور تسلسل سے کم نظر

آتا ہے۔ ہندوستانی سرزمین نے فارسی زبان کے ایسے ایسے شعراء پیدا کیے جن تک شہرتوں کے طوفان نے اصفہان وشیراز کے قصر تک ہلا دیئے جیسا کہ فارسی ادب کے ہر میدان میں ہندوستانی سرزمین پر تصنیف وتالیف کا دور چلا اسی طرح فارسی شاعری کے ہر صنف میں یہاں کے شعراء نے خوب طبع آزمائی کی۔ شاعری کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی گراں قدر خدمات بھی دیکھنے کو ملتی ہے اس میں صرف ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ ایران سے آنے والے مہاجرین کی کاوشیں بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اوران شعراؤں نے بھی ہر صنف میں اپنے علوم وفنون کا خوب زور دکھایا۔ فارسی زبان کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جتنا مغل دور میں فارسی زبان وادب کا رواج رہا اوراس کو ترقی ملی کسی اور دور میں نہیں ملتی۔ مغل دور کے شعراؤں نے تو اپنے ہنر وفن کا کمال دکھایا ہی اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے بادشاہ بھی علم وادب کا ذوق رکھتے تھے۔ اور شاعری بھی کرتے تھے۔ 'ظہیر الدین محمد بابر' نہ صرف ایک عظیم الشان سپاہی تھا بلکہ یہ ایک بلند پایہ اہل علم اور قابل قدر شاعر بھی تھا۔ بابر کی ایک معروف تصنیف ترکی زبان میں ''ترک بابری'' ہے اور ایک مثنوی، مبین، جس نام سے تصنیف کی۔ اس دربار کی ''واقعات بابری'' جو کہ فارسی ترجمہ ہی اور فتاویٰ بابری بھی ایک مشہور ومعروف تصنیف ہے۔

''ہمایوں'' کے دربار میں بھی شعراء ادباء اور حکماء کی بھیڑ رہتی تھی۔ یہ اس کی علم نوازی اور معارف پروری کی دلیل ہے۔ اس کے عہد کی تصنیفیں ''جوالبر نامہ ہمایوں'' گلِ افشاں اور قصیدہ حفظ صحت، وغیرہ بہت قابل قدر مانی جاتی ہے۔ ''اکبر'' کی علم وفن سے دلچسپی کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں ایسے ۱۲ ارباب کمال جمع ہوگئے تھے جو کسی ایک عہد یا ایک دربار میں مشکل سے ہی ملتے ہیں اس کے عہد میں متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں اور فارسی زبان میں ترجمہ بھی ہوئیں۔ مثلاً سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہوا جس کا نام اکبر نے ''خسر وافزاذ'' رکھا اور مہابھارت کا ترجمہ جس کا نام ''رزم نامہ'' رکھا گیا۔ رامائن، کامیلہ ورمنہ انجیل، لیلاوتی، اتھرین اور چوتھے کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ تذکرہ ہمایوں واکبر، حیاۃ الحیوان یہ سب تصنیفیں اکبر کے دربار کی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

''جہانگیر'' فارسی زبان کا ایک بہترین انشاء پرداز تھا۔ یہ شعروادب کا دلدادہ تھا۔ 'تزکِ جہانگیری' اس کا علمی شاہکار ہے اس کے دربار کی علمی یادگار تالیف اقبال نامہ جہانگیری، مائثہ جہانگیری دولتِ بیدار، انداز نامہ، مجالس المومنین، وغیرہ بہت مشہور ومعروف ہیں۔ ''شاہجہاں'' نے اگرچہ بابر ہمایوں اور جہانگیر کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اس کی زندگی علمی دلچسپیوں سے خالی نہیں۔ اس کے بھی عہد میں مختلف صنف میں ادباء وشعراء نے خوب طبع آزمائی کی۔ جیسے ظفر نامہ، شاہجہانی بادشاہ نامہ، معدالآثار، ناز ونیاز اور مہر وماہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''اورنگ زیب'' چار زبانوں سے واقف تھا۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی۔ یہ اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بھی عہد میں بہت ساری کتابیں تالیف ہوئیں۔ جیسے: فتاوی عالمگیری، ظفر نامہ عالمگیری، ثمرات الحیات، شمع وپروانہ، تذکرہ سرخوش، نغمات العشق، حسن وعشق کلمات الشعراء، قضاوقدر، طور معرفت، جبار عنصر طلسمِ حیرت، محیط اعظم وغیرہ اس کے عہد کی شاہکار تصنیف ہے۔

اورنگ زیب کی وفات دراصل مغلیہ حکومت کی زوال کی ابتدا تھی۔ جس کا خاتمہ بہادر شاہ ظفر پر ہوا۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آتا ہے جس میں مسلمان تعلیمی پسماندگی کا شکار ہوئے چلے گئے اور تعلیمی میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامے انجام نہ دے سکے۔ تعلیمی بیداری کے لیے متعدد مصلحین قوم بیدار ہوئے جن میں خاص طور سے سرسید احمد خاں کی شخصیت ناقابلِ فراموش ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمی کے لیے اس میدان میں اہم کردار وانسانی ترقی کے لیے تعلیم کا حصول نہایت ضروری ہے۔ اسی نقطہ نظر کو سرسید خاں نے نہ صرف اپنی سوچوں تک محدود

رکھا۔ بلکہ اس کو عمل میں لاکر رہتی دنیا کے لیے مشعل راہ بنادیا۔ سرسید نے اپنی تباہ شدہ مفلوک الحال قوم کی اصلاح اور اسے ترقی کی جانب گامزن کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے فوری طور پر دو اہم ترین تدبیریں اختیار کیں۔ ایسے رسالے لکھنا جس سے انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہوں جو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوگئی ہیں تاکہ آپسی مفاہمت کی صورت پیدا ہوسکے اور مسلمانوں کو ان کی موجودہ حالت سے نکالنے میں معاونت مل سکے۔ چنانچہ اپنے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند''، ''سرکشی ضلع بجنور'' اور لائل محمڈنز آف انڈیا'' جیسے رسالوں کی تصنیف واشاعت کی۔ موجودہ تباہی اور زبوں حالی سے نجات دلانے کے لیے عصری اور جدید انگریزی تعلیم حصول کے لیے تعلیمی اداروں اور تنظیموں کا قیام کیا اور مختلف علوم وفنون کے فروغ کے لیے انھوں نے زوردار مہم چلائی جو بعد میں ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے موسوم ہوئی اور مدرسۃ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم.اے.او.کالج) کا قیام کرکے اور اس کو مثال بنا کر پورے برصغیر میں عصری اور مغربی تعلیم کے فروغ کی کوششیں کیں اور سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک مدرسہ کا قیام کیا جس میں انگریزی زبان کے ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم فارسی زبان میں دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ غازی پور میں بھی انھوں نے ایک اسکول قائم کیا جو دراصل ان کی مجوزہ وسیع تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے ابتدائی اور تجرباتی کوششیں تھی اور بالآخر ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ میں 'مدرسۃ العلوم' یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ بقول سرسید احمد خاں:

> ''تعلیم وتربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چُنے جاتے اور ایک قاعدہ داں کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے پھر اگر تم چاہو ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکالو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔
>
> ہنر فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیے ایک متعصب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں اپنے تعصب کے بناء پر جاہل اور ناواقف رہتا ہے اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت بیکار ہوجاتی ہے اور تربیت وشائستگی تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا'' ۲

مذکورہ بالا اقوال سے سرسید احمد خاں کے جس قسم کے تعلیمی تصورات کی وضاحت ہوتی ہے اس کا مرکزی نقطہ ہے کہ ہندوستانیوں کو بالخصوص مسلمانوں کو تعلیم کے حصول میں سرگرم عمل ہوجانا چاہیے۔ تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیے اور ہر صورت اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کرنا چاہیے کیوں کہ تعلیمی بیداری اور تعلیمی ترقی کی صورت میں ہمیں ہر حال میں باعزت اور باوقار شہری کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اور ہمارے حقوق کے حصول کی راہ بخود بخود ہموار ہوجائے گی۔ سرسید یہ قطعی نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم کا معاملہ محض سرکاری اسکولوں کے بھروسہ رہے اور یہ سب چیزیں اس وقت ممکن تھا جب تعلیمی ادارے مسلمانوں کے اپنے ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر بھی انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

> ''ہندوستانیوں کی ترقی اس وقت ہوگی جب وہ اپنے باہمی چندے، اپنے انتظام، اپنی قوت سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اس کے افسروں کی خودسری اور مرض کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں'' ۳

سرسید احمد خاں کے تعلیمی تصورات میں مفید اور کارآمد تعلیم کے علاوہ ہندو مسلم کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد، قومی جذبے اور فروغ وطنیت، بین المسلمین اتحاد واتفاق اور معاشی ترقی اردو زبان وادب کی توسیع واشاعت اور عدم لسانی تعصب کی تیز رفتاری ہم آہنگ ہونے کی سرگرمی سبھی کچھ شامل تھے اور ان سب کے لیے انھوں نے تعلیم کو ہی ذریعہ بنایا تھا۔ ہندوستانی

مسلمانوں کی صحیح وثبت رہنمائی کرنے میں اور ان کے تعلیمی تصورات میں اس نصاب تعلیم کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے جو انھوں نے ''مدرسۃ العلوم'' کے قیام کے بعد اس میں تعلیم کے لیے ترتیب دیا تھا۔ جس میں ان کی تعلیمی فکر، تربیتی سوچ اور تعلیم وتربیت سے متعلق ان کی عملی کارکردگی بھی شامل تھی ذیل میں ان کے ترتیب کردہ نصاب تعلیم کو پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) علم وادب: زبان دانی وانشاء پردازی، اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور لاطینی زبان وادب کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات، مینٹل سائنس، منطق، فلسفہ اور سیاسیات۔

(۲) علم ریاضیات: علم حساب، جبر ومقابلہ، علم ہندسہ، فروعات اور علم اعلیٰ ریاضی۔

(۳) علم دینیات: فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اور سیرت اور عقائد

(۴) علم طبیعات: علم سکون، علم حرکت، علم آب، علم ہوا، علم ناظر، علم برق، علم ہیئت، علم آواز، علم حرارت اور نیچرل فلاسفی۔

(۵) علوم خاص: انجینئرنگ، علم حیوانات، اٹانوی (تشریح)، علم نباتات، طبقات الارض، علم جمادات، اور کیمیا۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت انتہائی دور اندیش تھی۔ انھوں نے اپنے دور کے حالات کے آئینے میں آنے والے سائنس ترقی کے زمانے کا نہ صرف عکس دیکھ لیا تھا بلکہ اس کے قدموں کی آہٹ اور معیار ومزاج کا ایک انتہائی تجربہ کار حکیم ونباض کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ لگالیا تھا کہ آئندہ کے سیاسی، سماجی، معاشی اور سائنسی ترقی کے ماحول میں جدید مغربی تعلیم کے حصول کے بغیر کسی طرح بھی مسلمان ہم آہنگ ہونے والے نہیں ہیں۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی عصری تعلیم پر زور دیا ان کے ذہن میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جس جدید انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کے حصول کا تصور تھا وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ اس کے لیے سرسید احمد خاں نے جدید طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام کو ضروری قرار دیا اور ایک ایسے تعلیمی ماحول کی تشکیل کا منصوبہ بنایا جس میں عقیدہ وایمان کے تحفظ وبقا اور مذہب وثقافت کی برقراری کے ساتھ ہندوستانی مسلمان آنے والے ترقی یافتہ حالات سے ہم آہنگ ہونے میں کامیابی حاصل کریں۔

سرسید احمد خاں نہ یکسر مشرق تھے اور مغرب پسند۔ ان کا مقصد صرف اور صرف مسلم نوجوانوں کے لیے ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں ذہنی وفکری بیداری ہو، اپنے حقوق کے حصول کی جرات ہو، حقائق پسندی ہو اور وقت وحالات کے قدموں کی آہٹ پہچاننے کی صلاحیت ہو اور نسل درنسل علم وفن اور ہنر وحرفت کے چراغ سے چراغ جلانے کی روایت قائم کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

سرسید احمد اس طرح رقم طراز ہیں:

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر''۔

''مسلمانوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان ہے۔ یہ فصاحت وبلاغت میں سمٹک زبانوں میں لاثانی ہے اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں، لیکن جب ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری زندگی بہ آرام بسر کرنے کے ذریعے بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرح بہت توجہ کرنی چاہیے''۔

''مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قوی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے مراد صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہیں''۔[۴]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کا سلسلہ ابتداء سے ہی اپنی تمام تر جمہ جہت خصوصیات کے ساتھ ہندوستان میں رائج

رہی۔عہد کے زوال کے بعد جب تعلیمی سرگرمیاں سرد پڑنے لگیں تو دیگر مصلحین قوم بیدار ہوئے جن میں سرسید کی شخصیت ناقابلِ فراموش ہے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی وانسانی ترقی کے لیے تعلیم کا حصول نہایت ضروری قرار دیا۔ پھر ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور پھر اپنے اس نقطہ نظر کو سرسید نے ایک تعلیمی ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے ذریعے رہتی دنیا کے لیے علم وادب کے ایک عظیم ذخیرے کے دہانے کو انسانیت کے لیے کھول دیئے۔

☆☆☆

کتابیات:

۱ تعلیم اور تعلیمی افکار، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، افضال احمد ڈومن پوری، مئوناتھ بھنجن، اصیلہ پریس، ۲۰۱۱ء، ص: ۱

۲ ایضاً، ص: ۱۸

۳ ایضاً، ص: ۱۸

۴ ایضاً، ص: ۲۰

بقیہ، ص: ۴۲ رکا

کاغذ معیاری ہے، قیمت بھی مناسب ہے۔آخر میں محبان اردو سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب (نغمات کوثر) کو خرید کر پڑھیں، بطور خاص نومشق شاعر حضرات کے لئے یہ کتاب انتہائی سودمند ثابت ہوگی، ان کو اپنی شاعری میں اس کتاب سے کافی مدد ملے گی۔

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵ رجنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تاکہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اقامتی غیر اقامتی ہے۔فی الحال اقامتی میں شعبہ ناظرہ، شعبہ حفظ، اردو، انگلش، حساب اور کمپیوٹر کی تعلیم کا عمدہ نظم ہے۔کیونکہ مدرسہ ہذا کو الحمدللہ ان علوم کے ماہرین کی خدمات حاصل ہے۔ان شاءاللہ مستقبل قریب میں مزید وسائل کے فراہم ہونے کی صورت میں درس نظامیہ اور مختصر مدتی عالم کورس، سیرت نبویؐ، تاریخ، دستورِ ہند وغیرہ کے شعبہ جات قائم کرنے کا ارادہ ہے اور ایسے افراد ان شاءاللہ تیار کرنا ہے جو عربی، انگلش، اردو زبان وغیرہ پر مکمل دسترس رکھیں، تاکہ ملک میں قومی یکجہتی اور بھائی چارگی کا بول بالا ہو۔اللہ رب العزت ان عزائم ومقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کو کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے، اور کوئی فیس طالب علموں سے نہیں لی جاتی ہے۔ایک طالب علم پر ماہانہ خرچ تقریباً ۱۵۰۰ر پندرہ سو روپے ہے۔فی الحال مدرسہ کا ماہانہ خرچ تقریباً ۵۰۰۰۰ر پچاس ہزار روپے ہے۔اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش ہے کہ دامے درمے، سخنے، زکوۃ، صدقات، عطیات اور اشیاء جات سے تعاون فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔جزاکم اللہ واحسن الجزاء۔

نغمہ تبسّم
پی ایچ ڈی اسکالر شعبۂ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پریم چند کے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرے کی عکاسی

اُردو ادب کی تاریخ میں پریم چند کا شمار ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔جن کا نام اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے افسانوی ادب کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے اُردو افسانے کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

ایک فنکار کے لحاظ سے پریم چند کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ان کے افسانوں کے موضوعات کے تنوع سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔چونکہ پریم چند گاؤں کی زندگی سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں۔اس لیے انھوں نے ہندوستان کے دیہی معاشرے کی زندگی کو اپنے بیشتر افسانوں میں موضوعِ بحث بنایا ہے۔غریب کسان،مزدوروں کی زندگی،کاشتکاروں کے رہن سہن،افلاس و استحصال کے شکار نچلے طبقے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ساتھ ہی ہندوستانی معاشرے کی قبیح رسوم،بیوہ عورتوں کے مسائل،بے جوڑ شادی،جہیز کی لعنت،ذات پات جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لاکر اپنی فنی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

پریم چند نے جس وقت لکھنا شروع کیا اس وقت ہندوستان میں ملک کی آزادی کے لیے مختلف طرح کی تحریکیں وجود میں آرہی تھیں۔جن سے پریم چند نے براہِ راست اثر قبول کیا اور آزادی کے حصول کے لیے ہندو مسلم آپسی اتحاد و اتفاق کو لازمی قرار دیا۔ان کا کہنا ہے کہ رنگ و نسل،زبان و عقائد،طرزِ فکر و طرزِ زندگی وغیرہ کے فرق کے باوجود سارے ہندوستانی آپس میں ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

پریم چند نے اپنے جن افسانوں میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرے پر قلم اٹھایا ہے۔وہاں وہ گاندھیائی تحریک سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ پریم چند اور گاندھی جی دونوں کا شمار ہمارے ملک کی عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے۔دونوں کا مقصد ایک ہی تھا،ایک نے اپنی آواز کا جادو جگایا اور ایک نے اپنی قلم کا،گاندھی جی تنگ نظری،فرقہ پرستی،ذات پات،رنگ و نسل،اور مذہب وملت کی تفریق کے سخت مخالف تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی دو قومیں ہندو اور مسلمان میری دو آنکھوں کی دو پتلیاں ہیں۔ان کا یہ بھی خیال تھا کہ دنیا میں جتنے بھی مذہب ہیں سب کے سب اعلیٰ ہیں اور ایک ہی مقام تک پہنچنے کے الگ الگ ذرائع ہیں۔لہٰذا گاندھی جی کا مذہب کے معاملے میں اندازِ فکر تنگ نظری سے کوسوں دور تھا۔وہ انسان کے اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہیں۔

گاندھی جی کے اقوال ونظریات کی روشنی میں اگر ہم پریم چند کی کہانیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں تو بہت سی باتیں آئینہ کی طرح صاف ہوجاتی ہیں اور یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دونوں کے خیالات ونظریات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔جس کا عکس جا بجا ہمیں پریم چند کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔اس ضمن میں پریم چند کے ان افسانوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہوگا جو نہ صرف گاندھی جی کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ پریم چند کے سیکولر ہونے کا بین ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔

اس طرح کے افسانوں میں پریم چند کا جو جذبہ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے وہ انسان دوستی،مساوات،محبت وخلوص اور ہمدردی کا جذبہ ہے۔انھوں نے اپنے جن افسانوں میں ہندوستانی تہذیب معاشرے کو پیشِ نظر رکھا ہے وہاں ایک ایسے کردار کو خلق کیا ہے جو نیکی و ایمانداری کا پتلا ہے۔جو نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان بلکہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی اقدار و روایات کا پروردہ ہے۔جس کی نگاہ میں انسان

دوستی، مساوات، نیکی وشرافت جیسی قدریں سب سے اعلیٰ ہیں۔

اس کی بہترین مثال بچوں کے لئے لکھا گیا افسانہ ''عیدگاہ'' ہے۔اس افسانے میں پریم چند کا فنی شعور انسانی سماج اور انسانیت کی بقاوتحفظ کے لیے ایک ایسے مناظر کی جستجو کرتا ہوا نظر آتا ہے۔جہاں امیر وغریب ،اعلیٰ وادنیٰ کے درمیان کوئی رقابت نہ رہے۔پریم چند کو یہ منظر عید کی نماز میں نظر آتا ہے۔

اگرچہ پریم چند مذہبی نقطۂ نظر سے ہندو ہیں اور مارکسٹ بھی، مگر اس افسانے میں عید کو رمضان سے منسلک کیا ہے ۔رمضان جوروحانیت کی علامت ہے۔پھر پریم چند نے عید کے اثر کو پورے ماحول بلکہ پوری کائنات پر مثبت ہوتے دکھایا ہے ۔درخت، کھیت، آسمان اور آفتاب طبیعات کا حصّہ ہیں مگر عید نے انھیں کچھ اور ہی بنا دیا ہے۔پریم چند کے افسانوں میں مساوات ،اور اخوت کے انسانی رشتوں کا ذکر افسانہ ''عیدگاہ'' کے تناظر میں کرتے ہوئے ڈاکٹر فردوس قاضی رقمطراز ہیں:

''پریم چند کی نظروں میں سب انسان برابر ہیں۔وہ طبقاتی درجہ بندی سے ساتھ اٹھتے بیٹھتے نظر آتے ہیں ۔جہاں کوئی بڑا تھا نہ چھوٹا۔اس ہم آہنگی نے پریم چند کو ایک وجدانی کیفیت سے دو چار کر دیا اور اخوت کے اس رشتے سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ افسانہ عیدگاہ نے جنم لیا۔''

(جدید اُردو افسانے میں سماجی وثقافتی جہات صفحہ نمبر 219)

عیدگاہ یعنی ایک ایسا عبادت خانہ جہاں بیک وقت سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں انسان بغیر کسی طبقاتی رقابت کے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔عیدگاہ میں عید کی نماز کے دوران ہزاروں انسانوں کا ایک ساتھ رب ذوالجلال کی بارگاہِ رسالت میں کھڑے ہونا اور ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا، یہاں نہ کوئی چھوٹا ہے اور نہ کوئی بڑا ہے۔یہاں سب برابر ہیں۔دیہاتیوں نے وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگئے کتنی باقاعدہ اور منظّم جماعت گویا بھائی چارگی کا رشتہ دلوں کو جوڑے ہوئے ہے۔دراصل پریم چند ہندوستان میں طبقاتی درجہ بندی اور سماجی اونچ نیچ سے قطع نظر ایک ایسے معاشرے کا تصور کرتے ہیں جہاں پر ہر انسان کو مذہبی اور سماجی اعتبار سے یکساں حقوق حاصل ہوں۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''عیدگاہ نظر آئی۔اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے جس پر جازم بچھی ہوئی ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری نہ جانے کہاں تک چلی گئی ہے۔کئی قطاریں کھڑی ہیں جو آتے ہیں پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔آگے اب جگہ نہیں ہے۔یہاں کوئی رتبہ کوئی عہدہ نہیں دیکھا جاتا ۔اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔دیہاتیوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگئے۔کتنی باقاعدہ اور منظّم جماعت ہے۔لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں اور ایک ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ایسا معلوم ہو رہا تھا۔گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں اور یہی سلسلہ چلتا رہا۔کتنا بے مثال منظر تھا جس کی ہم آہنگی اور وسعت دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔کوئی ایسی کشش ہے جس نے سب کو ایک لڑی میں پیرو دیا ہے۔'' (افسانہ ''عیدگاہ'' پریم چند)

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے زیرِ اثر تشکیل پانے والے معاشرے میں تہوار خاص اہمیت رکھتے ہیں۔چونکہ ہندوستان مشترکہ تہذیب والا ملک ہے۔یہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔تہوار چاہے کسی بھی مذہب کے ماننے والے کا ہو پورا معاشرہ اسے آپسی اتحاد اور پورے جوش وخروش سے مناتا ہے۔جیسے یہ تہوار کسی خاص فرقہ کا نہ ہو کر پورے معاشرے کا ہو۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں منائے جانے والے بیشتر تہوار جیسے عید، ہولی، دیوالی اور دسہرہ وغیرہ قومی یک جہتی کی علامت اختیار کر گئے ہیں۔ان تہواروں نے لوگوں کے

دلوں کو جوڑ کر ایک طرح سے بھائی چارگی کے رشتے کو قائم کیا ہے۔ پورے معاشرے کی شمولیت نے خارجی سطح پر ان تمام تہواروں کو ایک جیسا بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک جیسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر چہ ان کو منانے کی وجوہات مختلف ہیں اور اس کی بنیادی روح ایک دوسرے سے جدا ہے۔ افسانہ ''عجیب ہولی'' میں ہولی کی خوشی اور دھوم دھام ملاحظہ ہوں:

''دعوت پا کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ بھنگ کا نشہ چڑھا ہی ہوا تھا۔ ڈھول مجیرے چھوڑ چھاڑ کر نور علی کے ساتھ چلے اور صاحب کے کھانے کے کمرے میں کرسیوں پر جا بیٹھے۔ نور علی نے وسکی کی بوتل کھول کر گلاس بھرے اور چاروں نے ڈھالنا شروع کر دیا۔ ٹھرا پینے والوں نے جب یہ مزیدار چیزیں پائیں تو گلاس پر گلاس چڑھانے لگے۔۔۔۔ ایک نے پھاگ چھیڑا ،دوسرے نے سر ہلایا اور گانے ہونے لگے۔ نور علی نے ڈول مجیرا لا کر رکھ دیا۔ وہیں مجلس جم گئی۔ گاتے گاتے ایک اٹھ کر ناچنے لگا، دوسرا اٹھا۔ حتی کی سب کے سب کمرے میں چوکڑیا بھرنے لگے۔

(افسانہ ''عجیب ہولی'' پریم چند)

ہندوستانی تہذیب و معاشرے میں تہواروں کی کثرت کی وجہ سے جہاں رام لیلا، کرشن لیلا اور نوٹنکی وغیرہ کا سماجی تقریبات کے طور پر وجود عمل میں آیا، وہیں مختلف طرح کے کھیلوں جیسے جوسر، چوپڑ اور شطرنج وغیرہ کو بھی ہمارے ہندوستانی معاشرے میں زمانۂ قدیم سے اہمیت حاصل رہی۔ افسانہ ''شطرنج کی بازی'' میں پریم چند نے شطرنج کے کھیل کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''دونوں کھیلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا وہ خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے۔ اب چوتھی بازی کا بھی رنگ اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے، خوب سنبھل سنبھل کر طبیعت پر زور دے دے کر کھیلتے تھے۔ لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی کہ ساری بازی بگڑ جاتی تھی۔''

(افسانہ ''شطرنج کی بازی'' پریم چند)

ہندوستانی تہذیب کے زیر اثر ہمارے ملک میں ایک ایسے صالح معاشرے کا قیام عمل میں آیا، جہاں معاشرتی تقریبات کے تحت مختلف طرح کے رسم و رواج کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ مثال کے طور شادی بیاہ کی رسمیں جو شادی سے کچھ دن پہلے انجام دی جاتی ہیں اور یہ کئی دن تک چلتی ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں ازدواجی زندگی کو ایک معاشرتی ادارے کی حیثیت حاصل ہے اور شادی بیاہ کی رسموں کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا ایک اہم عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے افسانہ ''بوڑھی کا کی'' میں ہندوستانی معاشرے میں شادی بیاہ کی رسموں کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے:

''بدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی اور گاؤں کے بچوں کا جمِ غفیر نگاہِ حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ چار پائیوں پر مہمان لیٹے ہوئے نائیوں سے ٹکیاں لگوا رہے تھے۔ قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا گیت سنا رہا تھا۔۔۔۔ گھر میں مستورات گا رہی تھی اور روپا مہمانوں کی دعوت کا سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹیوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں۔ دوسرے میں سموسے اور پیڑا کیں بنتی تھیں۔''

(افسانہ ''بوڑھی کا کی'' پریم چند)

ہمارے ملک میں منائے جانے والے تہواروں، سماجی تقریبات وغیرہ کو ہندوستانی تہذیب و معاشر میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو نہ صرف دلوں کو جوڑنے اور آپسی اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں بلکہ ملک کی تہذیب وتمدن کو عظمت کی بلندیوں پر پہنچانے کے لیے ملک وقوم

کے تئیں ہر شخص کے دلوں میں وطن دوستی اور وطن پرستی کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں، کیونکہ وطن سے محبت بھی ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ پریم چند کے متعدد افسانے وطن دوستی اور وطن پرستی کے جذبات سے معمور ہو کر لکھے گئے ہیں۔ افسانہ ''قاتل'' کا شمار پریم چند کے ایسے ہی افسانوں میں کیا جاتا ہے۔ جس کا مرکزی کردار اپنی ماں کو وطن کی عظمت بتاتے ہوئے کہتا ہے:

''تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے اسے تمہارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں لیکن مادرِ وطن نے تمہیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے۔ اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آجائے کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت میں تمہیں قتل کرنا پڑے تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منھ نہ موڑ سکوں گا۔'' (افسانہ ''قاتل''، پریم چند)

ہندوستانی تہذیب و معاشرے میں انفرادی طرزِ زندگی کی بجائے اجتماعی طرزِ زندگی کو فوقیت حاصل ہے اور گھر کو ایک بنیادی اکائی تصور کیا جاتا ہے۔ جس کے زیرِ اثر ہندوستان میں مشترکہ خاندان کا تصور وجود میں آیا۔ جس میں کئی پیڑھیاں نسل در نسل زندگی گزارتی ہیں۔ مشترکہ خاندان معاشرے کا ایک ایسا متحرک معاشرتی ادارہ ہے، جو ملک کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کا ایک اہم جز ہے۔ جہاں سے ہمیں نہ صرف رشتوں کے تئیں ادب و احترام کا درس ملتا ہے بلکہ محبت اخوت، صبر و قناعت اور آپسی اتحاد و اتفاق جیسی تعلیم بھی ملتی ہے۔ جس سے ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مشترکہ خاندان میں مرکزی حیثیت عورتوں کو حاصل ہے۔ جو اپنے حسنِ اخلاق اور حسنِ انتظام سے گھر کو جنت بناتی ہے۔ جس کی عمدہ مثال پریم چند کا افسانہ ''مالکن'' ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''کئی مہینے گزر گئے۔ پیاری کے اختیار میں آکر جیسے اس گھر میں بہار آگئی۔ اندر باہر جہاں دیکھئے ایک لائق منتظم کی سلیقہ شعاری،، صفائی پسندی اور خوش مذاقی کے آثار نظر آنے لگے۔ پیاری نے گرہستی کی مشین کی ایسی کنجی کس دی کہ سب ہی پرزے ٹھیک ٹھیک چلنے لگے۔'' (افسانہ ''مالکن''، پریم چند)

اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند ایک غیر متعصب ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے زیادہ تر افسانے ہندو تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں لیکن جہاں انھوں نے مسلم تہذیب و معاشرے کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے وہاں ان کے مشاہدے کی گہرائی و گیرائی انتہائے کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ جس کی عمدہ مثال افسانہ ''حج اکبر'' ہے۔ جو مسلم معاشرے سے پریم چند کے حد درجہ متاثر ہونے کا بین ثبوت پیش کرتا ہے۔

منشی صابر حسین متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا نصیر ہے۔ جس کی پرورش کے لیے ایک دایہ عباسی ملازمہ رکھی ہے۔ صابر حسین کی بیوی عباسی کو مالی بوجھ سمجھتی ہے اور اس کو اکثر تنگ کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ ملازمت چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ نصیر عباسی سے بہت مانوس ہوتا ہے اور یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتا ہے اور بیمار پڑ جاتا ہے۔ اتفاقاً بازار میں اس کی ملاقات صابر حسین سے ہوتی ہے۔ وہ اسے بیٹے کی بیماری کا حال سناتا ہے۔ عباسی بے قرار ہو اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ نصیر کا چہرہ اس کو دیکھ کر کھل جاتا ہے۔ عباسی صابر حسین کو بتاتی ہے کہ وہ حج پر جا رہی ہے۔ مگر صابر حسین بچے کی بیماری کو بیان کر کے اس کو جانے سے روک لیتا ہے۔ بعد میں جب عباسی اس سے کہتی ہے کہ تم نے مجھے حج پر نہیں جانے دیا تو صابر حسین کہتا ہے کہ تم نے میرے نصیر کو بچا کر حجِ اکبر کر لیا۔

''نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ جیسے بجھے ہوئے چراغ میں تیل جائے۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ کچھ پڑھ گیا ہے۔ ایک ہفتہ گزر گیا صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کر کے بولے۔ ''تمہاری انّا کو مار کر بھگا دیں گے۔'' نصیر نے منھ بنا کر کہا۔ ''نہیں

روئے گی۔'' عباسی بولی'' کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا ۔صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔'' تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔'' (افسانہ ''حجِ اکبر'' پریم چند)

بظاہر یہ ایک عام سی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے اندر بڑی گہری معنویت چھپی ہوئی ہے۔ معاشرے میں اس وقت عزت کا معیار صرف دولت ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ معاشرے میں تقویٰ، پرہیز گاری، صلہ، رحم اور ہمدردی کا کوئی مول نہیں ہے۔ پریم چند نے اس افسانے کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی شخص کے بزرگ ہونے کا انحصار اس بات میں نہیں ہے کہ وہ مذہب سے کتنا لگاؤ رکھتا ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ اس کا وجود معاشرے کے لیے کتنا سودمند ہے اور یہی نیکی کا اصل معیار ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں مذہب کا تصور اگرچہ اجتماعی حقیقت کے بجائے ہمیں انفرادی سچائی کی طرف متوجہ کرتا ہے کیونکہ انفرادی تبدیلی ہی سماجی تبدیلی کا باعث بنتی ہے اور آپسی اتحاد سے رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں نیکی و شرافت اور عفو کے تصور کو تقویت ملتی ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی نشو نما میں نیکی اور عفو کے تصورات کو ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ مذہبی نفرتوں اور تفریق کی فضا میں افسانہ ''عفو'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ افسانہ ہسپانیہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے میں مذہبِ اسلام کے اصل جوہر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس مذہب میں ذاتی بغض وعناد کچھ نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا وہ سب کچھ اللہ کی مرضی اور حکم پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عربوں کا دشمن داؤد شیخ حسن کے اکلوتے بیٹے جمال کو قتل کر دیتا ہے اور جب داؤد کے لیے فرار کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں تو وہ حسن کے خیمہ میں پناہ مانگتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کے بیٹے کا قاتل ہے پھر بھی انتہائی غم وغصّہ کے باوجود شیخ حسن داؤد کو کوئی سزا نہیں دیتا ہے۔ بلکہ عفو ورحیم اور بھائی چارگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اسے معاف کر دیتا ہے بلکہ اس کو محفوظ مقام پر پہنچنے کے لیے اپنی اونٹنی بھی پیش کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''شیخ حسن ایک لمحہ تک سکوت میں کھڑا رہا۔ پھر بولا ۔میں نے تمہیں معاف کیا۔۔۔۔ ہمارے نبی نے وہ تعلیم نہیں دی تھی جس پر ہم آج عمل کر رہے ہیں۔ وہ خود عفو ورحیم کے بلند ترین معیار تھے۔ میں اسلام کے نام کو بٹہ نہ لگاؤں گا۔ میری اونٹنی لے لو اور راتوں رات جہاں تک بھاگ سکو، بھاگ جاؤ۔''

(افسانہ ''عفو''، پریم چند)

ہندوستانی تہذیب ومعاشرے میں مذہب کا یہی وہ مثبت پہلو ہے جو سماج میں ردِعمل کے سلسلے کو منقطع کر کے ہمیں یہ تعلیم دیتا کہ ہم آپسی رنجش کو بھلا کر ایک دوسرے کو معاف کر کے اتحاد کے ساتھ مل جل کر رہیں کیونکہ یہی وہ عناصر ہیں جو ہندوستانی معاشرے میں مشترکہ تہذیب وثقافت کی کامیابی کا ضامن ہیں۔

آخر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کو پیش کرنے میں اپنی وسیع النظری اور ذہنی وسعت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب ومعاشرے کی ترجمانی خالص ہندوستانی ماحول میں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے مختلف عناصر کی عکاسی ملتی ہے۔ مذکورہ بالا تنقیدی جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پریم چند کے افسانوں سے اگر ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کو الگ کر دیا جائے تو ان کی اصل قدر و قیمت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ بہر حال اردو افسانے میں پریم چند ایک مختلف اور منفرد حیثیت کے مالک ہیں اور اسی بات میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

آصفیہ شمیم
پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

ڈاکٹر زور کے تدوینی کارنامے

تدوین کے معنی متفرق اشیاء یا اجزاء کو اکٹھا کر کے ان کو ترتیب دینا ہے کہ متن ک اس طرح پیش کرنا کہ جس طرح مصنف نے اسے آخری بار لکھا تھا۔ اسی عمل کا نام تدوین ہے۔ بعض دفعہ کی متن کے متعدد نسخے ملتے ہیں ایسی صورت میں اس کے مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کر کے صحیح متن تیار کیا جاتا ہے کبھی کبھی کے متن کا ایک ہی نسخہ ملتا ہے ایسی صورت میں اسی ایک نسخے کا مطالعہ کر کے مصنف کے خیال کو پیش کیا جاتا ہے۔ تدوین متن کا کام انجام دینے کے لیے محقق میں تخلیقی صلاحیتوں کے علاوہ اور بہت سے اصناف سخن کا جاننا ضروری ہے، جسے علم بیان علم معانی اور علم بدیع سے واقفیت فارسی زبان پر عبور مخطوطہ شناسی میں ملکہ اور سب سے بڑھ کر تدوین کے طریقہ کار و آداب سے ذہنی لگاؤ ہونا چاہئے۔

خدائے برتر نے ڈاکٹر زور کو تحقیقی مزاج کے ساتھ ساتھ تدوین متن کی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قدیم ادب کے شہ پاروں کی تدوین میں بے نظیر کارنامے انجام دیتے، ان کی کوششوں کی بدولت گوشۂ گمنامی سے منظر عام پر آئے۔ ڈاکٹر زور کے تدوینی کارنامے حسب ذیل ہیں۔

گلزار ابراھیم

ڈاکٹر زور نے انجمن ترقی اور ہندی کی فرمائش پر علی ابراھیم خان کے تذکرہ گلزار ابراہیم کی تدوین کی تھی۔ ۱۹۸۴ء میں کتاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پریس کی جانب سے شائع ہوئی علی ابراھیم خان اردو کے ایک نامور مورخ ادیب اور شاعر تھے، علی ابراھیم کی شہرت کا دارومدار تذکرہ گلزار ابراھیم پر ہی ہے، انہوں نے یہ تذکرہ فارسی میں لکھا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے منشی سید حیدر بخش حیدری نے اس تذکرہ کا ''گلشن ہند'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا گلزار ابراھیم میں ۳۱۹ شعراء کے حالات کا ذکر ہے، جبکہ گلشن ہند میں صرف ۷۰/شاعروں کے حالات درج ہیں گلزار ابراھیم کے پیش لفظ میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ عام طور پر تذکرہ نگار شعراء کے حالات سے زیادہ نمونہ کلام کو اہمیت دیتے ہیں لیکن علی ابراھیم نے شعراء کی زندگی کے حالات کی تحقیق پر زیادہ زور دیا ہے اس تذکرے کا خاص وصف یہ ہے کہ اس سے بارہویں صدی ہجری سے قبل شمالی ہند میں اردو ادب کی نشو ونما کا پتہ چلتا ہے۔

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ

دیوان شاعر سلطنت گولکنڈہ کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کے ضخیم کلیات کی تدوین ڈاکٹر زور کا سب سے اہم اور بے مثال کارنامہ ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کو ڈاکٹر زور نے کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ تین مخطوطوں اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے ایک قلمی نسخے کی مدد سے تین سال کی کڑی محنت اور جانفشانی کے بعد مرتب و مدون کیا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں کلیات محمد قلی کے مخطوطات میں سے ایک مخطوطہ نہایت قدیم ہے۔ اسی نسخہ میں طلائی کام کیا گیا ہے اور یہ باتصویر بھی ہے، اس کی کتابت سلطان محمد قلی کی زندگی ہی میں ہوئی تھی، اس نسخے کی اکثر غزلوں اور نظموں میں محمد قلی نے اپنا تخلص ''معانی'' استعمال کیا ہے البتہ کہیں کہیں قطب یا قطب شہہ بھی ملتا ہے کتب خانہ سالار جنگ کا ایک اور مخطوطہ بھی شاہی نسخہ ہے لیکن یہ محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے، اسی نسخے میں اکثر مقامات پر شاعر نے اپنا تخلص قطب شہہ اعمال کیا ہے، اس وجہ سے بعض محققوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ

پہلا مخطوط سلطان محمد قلی کا کلیات ہے اور دوسرا مخطوطہ سلطان محمد قطب شاہ کا ہے ڈاکٹر زور نے نہایت باریکی سے اس غلط فہمی کو دور کیا اور مختلف دلیلوں کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ معانی اور قطب شہہ محمد قلی کے تخلص ہیں اور خصوصا مقطعوں میں معانی کے بجائے قطب شہ بطور تخلص لایا گیا ہے، اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

'' معلوم ہوتا ہے کہ خود سلمان محمد قلی نے آخر میں معانی کی جگہ قطب شہ تخلص کرنے کو ترجیح دی تھی، اس لیے پہلا دیوان مرتب ہونے کے بعد جو کچھ لکھا وہ اسی تخلص سے لکھا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعد سلطان محمد نے اس کلام مرتب کرتے وقت ہر جگہ معانی نکال کر قطب شہ ڈال دیا ہوگا''۔

کلیات محمد قلی کا تدوین ڈاکٹر زور کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے، جس کی بدولت اردو زبان میں قدیم ترین شعراء کے کلیات کی تلاش وتحقیق، ترتیب وتدوین کا باضابطہ آغاز ہوا ،ڈاکٹر زور کی یہ کتاب ایک ہزار اڑسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب میں تدوین کلام سے قبل ڈاکٹر زور نے ۳۳۵ صفحات پر ایک سیر حاصل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے انہوں نے محمد قلی کے حالات وسوانح پوری تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے ہیں اور اس عہد کی تہذیب وثقافت کا دل آواز نقشہ کھینچا ہے۔ ڈاکٹر زور کی اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد قلی کی شاعری کا مزاج اور ماحول خالص ہندوستانی ہے اس میں دکن کی مٹی کی خوشبو اور سرزمین دکن کے درختوں کی ٹھنڈک ہے۔

ڈاکٹر زور کے مرتبہ ملکیت محمد قلی کے پہلے حصے میں مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی نظمیں ہیں، جن کی تعداد ۲۲۰/ ہے۔ ان میں ہر موضوع پر ایک سے زائد نظمیں ملتی ہیں، جن سے شاعر کے ذہن کی وسعت اور فکر کے تنوع کا پتہ چلتا ہے۔ کلیات محمد قلی کا دوسرا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، جس میں ۳۱۲/ غزلیں ہیں۔ تیسرے حصے میں دیگر اصناف سخن کے عنوان سے محمد قلی کے ۱۲/ قصیدے، ۴۱/ رباعیاں اور ایک مختصر مثنوی شامل ہے۔

طالب ومونی

مثنوی طالب ومونی سید محمد والہ موسوی کے تصنیف ہے والد ایک ایرانی نژاد امیر تھے جو شاہ عالم کے عہد حکومت میں دہلی آئے بعد میں وہ دکن منتقل ہوئے والہ بہت بڑے مصنف، شاعر اور انشاء پرداز تھے، ان کی مثنوی طالب ومونی کو دکن میں بڑی تاریخی شہرت حاصل ہوئی، اس مثنوی میں انہوں نے اورنگ آباد اور عثمان آباد کے ایک تاریخی شہر پرنیدۂ کی ایک مقبول عام عشقیہ داستان نظم کی ہے جو ۱۱۳۷ء سے قبل لکھی گئی۔ طالب مونی کا قصہ ایک ہندو مہاجن کی بیٹی مونی اور ایک مسلمان نوجوان طالب کے عشق کی درد بھری داستان ہے طالب ومونی کے تین قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں۔

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو قلمی نسخے کی مدد سے ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کا متن مرتب کیا کتاب کے آغاز میں مصنف مصنف اور اس کی تصنیف کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس خیال کو غلط بتلایا ہے کہ والہ قطب شاہ دور کا شاعر ہے چونکہ والہ نے اس مثنوی میں قطب شاہی دور کے شاعر ابن نشاطی اور ان کی ''پھول بن'' کا تذکرہ کیا ہے اس لیے والہ کو قطب شاہی دور کے ''پھول بن'' کے جواب میں لکھی تھی، لیکن طالب ومونی ''پھول بن'' کے مرتبے کو نہیں پہنچتی۔

طالب ومونی کی اس اعتبار سے اہمیت ہے کہ میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کا قصہ والد کی اس مثنوی سے لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زور کے قدیم ادب سے متعلق ان کے بعض ادھورے اور نامکمل کام بھی غیر معمولی نوعیت کے حامل ہیں، جو کئی وجہ سے منظر عام پر نہیں آسکے۔

ارشادنامہ

ارشادنامہ بیجاپور کے مشہور صوفی شاعر سید شاہ برہان الدین جانم کی عارفانہ مثنوی ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو

کے قلمی نسخے کی مدد سے ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کا متن مرتب کیا۔ اس کتاب کی تدوین ۱۹۳۷ء میں کی گئی، یہ مثنوی ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس مثنوی کے فوری بعد جانم کی نظم ''سکھ سہیلائی'' نقل کی گئی ہے ارشادنامہ کو ڈاکٹر زور کے شاگرد مولوی اکبرالدین صدیقی نے ایک سے زائد نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے ۱۹۷۱ء میں شائع کروایا۔

سکھ سہیلا

سکھ سہیلا جانم کے مشہور صوفیانہ نظم ہے جانم کے اس پہلے میں ۲۸ر بند ہیں۔ ڈاکٹر زور نے سکھ سہیلا کے مکمل متن کی تدوین کی ہے لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ انہوں نے کتنے اور کون کون سے قلمی نسخوں کی مدد سے یہ متن تیار کیا۔

ابراھیم نامہ

ابراھیم نامہ عبدل کی تصنیف ہے وہ سلطان ابراھیم عادل شاہ ثانی کے دور سے تعلق رکھتا تھا، یہ مثنوی ۱۶۰۳ء کی تصنیف ہے، کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کے قلمی نسخے کی مدد سے ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کا متن تیار کیا۔ کئی وجہ سے اس کتاب کی اشاعت عمل میں نہ آسکی۔

تاج الحقائق

ڈاکٹر زور کے نامکمل تحقیق وتدوین منصوبوں میں دکنی نثر کی مشہور کتاب ''تاج الحقائق'' کی تدوین بھی شامل ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کے قلمی نسخے کی مدد ڈاکٹر زور نے ''تاج الحقائق'' کی تدوین کی۔ اس کتاب کا بڑا حصہ طبع بھی ہو چکا تھا، بعد میں یہ کام ادھورا رہ گیا ''تاج الحقائق'' میراں جی شمس العشاق نے لکھی تھی۔ ان کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر زور نے دکن اور شمال کے لکھنے والے بعض شعراء کے کلام کے انتخابات بھی اپنے مفید مقدموں کے ساتھ شائع کیا ہے جن میں معانی سخن، قصص خوب ترنگ اردو شاعری کا انتخاب اور سخن سیریز قابل ذکر ہیں۔

اردو شاعری کا انتخاب ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر زور نے ساہتیہ اکیڈمی کی فرمائش پر لکھی تھی ۳۰۶ر صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اردو کے بہترین نمائندہ شعراء کے منتخب کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے ۳۸ر شعراء کے منتخب کلام کا انتخاب کرنے میں ڈاکٹر زور نے پانچ سال صرف کیے ہر شاعر کے کلام سے پہلے چند سطور میں اس کے واقعات، حیات اور شاعری کے بارے میں اہم معلومات قلم بند کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر زور کی ترتیب وتدوین کے ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ دکنی ادب کی تاریخ تحقیق وتدوین اور لسانیات کے علاوہ تدوین کے شعبے میں بھی انہوں نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

بقیہ، ص: ۴۰ر کا

دوسری بار فٹبال کی عالمی فاتح بننے کے لیے میدان میں اتری تھی۔ کروشیا نے 1998 میں آخری بار سیمی فائنل کھیلا تھا جہاں اسے فرانس کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اب 2018 کے ورلڈ کپ کے فائنل میں فرانس ہی اس کے مدمقابل ہے۔ فرانس کے مینجر دیدیئر ڈیچیمپس کا بطور مینیجر یہ تیسرا عالمی کپ ہے اور فرانس کی فتح کے بعد وہ بطور کھلاڑی اور بطور مینیجر عالمی کپ کی ٹرافی اٹھانے والے پہلے کھلاڑی بن گئے ہیں۔۔ خیر۔ یہ فٹبال عالمی کپ کئی معنوں میں بہت مختلف تھا۔ ٹورنامنٹ میں کئی بڑی ٹیمیں کوالیفائی نہیں کر پائیں۔ یعنی فیفا عالمی کپ امریکہ جیسی بڑی ٹیم کے بغیر کھیلا گیا۔ ٹورنامنٹ شروع ہوا۔ تو ایک کے بعد ایک کئی بڑی ٹیمیں ٹورنامنٹ سے باہر ہوتی چلیں گئیں۔ پرتگال۔ جرمنی۔ برازیل۔ اسپین اور انگلینڈ کی ٹیموں نے فٹبال شائقین کو مایوس کیا۔ میزبان روس کی شاندار شروعات ضرور ہوئی۔ لیکن یہ ٹیم بھی آخری پڑاؤ تک جاتے جاتے ٹورنامنٹ سے باہر ہوگئی۔

احمد نور عینی
پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اقبال فہمی

رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

حل مفردات:

خشت: اینٹ۔ سنگ: پتھر۔ چنگ: ایک قسم کا باجہ۔ صوت: آواز۔ نمود: ظہور۔

تشریح: اقبال نے مذکورہ بالا شعر کے پہلے مصرع میں مختلف فنون کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوسرے مصرع میں یہ اصول بتایا ہے کہ کسی بھی فن یا کسی بھی عمل میں کمال اور پائیداری کیوں کر پیدا ہوسکتی ہے۔

رنگ سے مصوری، خشت سے معماری، سنگ سے سنگ تراشی، چنگ سے موسیقی، اور حرف وصوت سے شاعری؛ نثر نگاری؛ خطابت ونغمہ سنجی مراد ہے۔ گویا جز بول کر کل مراد لیا گیا ہے، جس کو بلاغت کی اصطلاح میں 'مجاز مرسل' کہتے ہیں۔ دوسرے مصرع میں خون جگر کی تعبیر اقبال کی ایک مخصوص تعبیر ہے، جذبۂ صادق، دل میں انگڑائی لینے والی سچی تڑپ اور اخلاص کو اقبال سوز جگر یا خون جگر سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس شعر میں اقبال کا یہ پیغام ہے کہ آپ کا تعلق کسی بھی فن یا پیشے سے ہو یا آپ کوئی بھی کام انجام دے رہے ہوں، آپ کے فن اور آپ کے عمل میں پائیداری ودوام اور کمال واستحکام پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اخلاص اور جذبۂ صادق کی فراوانی ہو۔

صحبتِ اہلِ صفا نور و حضور و سرور
سرخوش و پرسوز ہے لالہ لبِ آبجو

حل مفردات:

اہل صفا: صاف دل والے، نیک لوگ۔ لالہ: ایک قسم کا سرخ پھول۔ آبجو: چشمہ، ندی، نہر۔ لبِ آبجو: ندی کے کنارے۔

تشریح: اس شعر میں اقبال نے صاف دل وپاکباز شخصیتوں کی مصاحبت اور ہم نشینی اختیار کرنے کی اہمیت وافادیت کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ جس طرح دریا کے کنارے کھلنے والا گل لالہ پانی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے سرسبز وشاداب رہتا ہے اسی طرح اہل صفا وباوفا لوگوں کی ہم نشینی اختیار کرنے والے کا دل روشن اور ذہن یکسو ہوتا ہے، اس کی زندگی نشاط وسرور سے بھرپور ہوتی ہے۔

اس شعر میں اقبال نے اہل صفا کی ہم نشینی اختیار کرنے والے کو اس لالہ سے تشبیہ دی ہے جو دریا کے کنارے لہلہاتا ہے، وجہ تشبیہ دونوں کا بافیض مصدر کی معیت اختیار کرنا اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر نکھار وبہار کا پیدا ہونا ہے، یہ تشبیہ اس شعر میں صراحتاً نہیں لائی گئی ہے بل کہ شعر پڑھنے سے یہ تشبیہ ضمناً سمجھ میں آتی ہے، اس کو بلاغت کی اصطلاح میں تشبیہ ضمنی کہتے ہیں۔

اس شعر میں اقبال نے لالہ بول کر پودے اور نباتات مراد لیے ہیں، یعنی جزو بول کر کل مراد لیا ہے جس کو بلاغت کی اصطلاح میں مجاز مرسل کہتے ہیں اور پرسوز کے لفظ سے لالے کی سرخی کی طرف اشارہ کیا ہے، لالے کی سرخی اس کی رعنائی وبرنائی اور روئیدگی وبالیدگی کی غمازی کرتی ہے۔

اس شعر کا پیغام یہ ہے کہ نیک دل وباصفا انسانوں کی ہم نشینی اختیار کرنی چاہیے کہ اس سے زندگی سنورتی ہے اور افسردگی وپژمردگی کے بجائے مسرت وفرحت اور نشاط وانبساط کی کیفیات سے دل معمور رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اچھے لوگوں کی صحبت اچھا بناتی ہے۔

ع صحبت صالح ترا صالح کند

ڈاکٹر عبدالحنان رہبر
مبارکپور اعظم گڑھ

غزل

ارض یہ مجھ سے مرا خون جگر مانگتا ہے
دل کے میداں میں نیا جذبۂ تر مانگتا ہے

زندگی وقت کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
ایڑیاں مجھ سے رگڑنے کا ہنر مانگتا ہے

پھر مرے خواب کی دہلیز پہ آکر کوئی
گنگناتی ہوئی بیدار سحر مانگتا ہے

دل میں ایماں کی حرارت کے نہیں برق وشرر
بے اثر ہوکے دعاؤں میں اثر مانگتا ہے

رنگ اور نسل کے نفرت بھرے اس جنگل میں
ہر درندہ کسی انسان کا سر مانگتا ہے

ہر جہاں چھوڑ کے جو تیری نظر لے جائے
دل مرا تجھ سے وہی راہ گزر مانگتا ہے

بحر الفت کا دل وجاں میں اٹھا کر طوفاں
بندہ خود اشک ندامت کے گہر مانگتا ہے

ٹھوکریں کھاکے نہ گر جاؤں کہیں میرے خدا
دل مرا تجھ سے بصیرت کی نظر مانگتا ہے

رنگ شامل ہو ترے خون کا جس میں رہبؔر
کل کا اخبار وہی تازہ خبر مانگتا ہے

ڈاکٹر محمد اختر الدین
ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

غزل

کیا ہوگیا لوگوں کو یہ کیا دیکھ رہے ہیں
جو اپنی جفاؤں میں وفا دیکھ رہے ہیں

مظلوم کی فریاد کا شاید یہ اثر ہے
ہر سمت جو مسموم فضا دیکھ رہے ہیں

اس دور کو ہم کیسے کہیں عہد ترقی
ہر ظلم وستم جس میں روا دیکھ رہے ہیں

ہر ایک ادا ان کی بہت خوب ہے لیکن
ہم ان کے تبسم کی ادا دیکھ رہے ہیں

یوں ہم پہ بھی اک بار محبت کی نظر ہو
ہم کب سے تجھے جانِ وفا دیکھ رہے ہیں

تم دولت دنیا کو سمجھتے ہو امیری
ہم زہدوقناعت میں غنا دیکھ رہے ہیں

پہنچادے ہمیں منزلِ مقصود پہ اخؔتر
ہم ایسا کوئی راہ نُما دیکھ رہے ہیں

اردو کا مستقبل روشن اور تابناک ہے: پروفیسر ایس اے شکو

تقریب رسم اجرا ''خواب محل'' میں حضرت رحمٰن جامی، ڈاکٹر مسعود جعفری، شفیع اقبال، جسٹس اسماعیل، محمد عبدالرحیم خان، رحیم رامش، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی کا خطاب



حیدرآباد: کچھ عرصہ قبل حیدرآباد میں ادیب وشاعر کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی، جتنی آج کے دور میں ہے، جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یقیناً اردو کا مستقبل روشن اور تابناک ہے، بطور خاص ریاست تلنگانہ میں اردو نے زیادہ ترقی کی منزلیں طے کی ہیں، یہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، یہاں بہت سارے معیاری اخبارات شائع ہوتے ہیں، اردو کی یونیورسیٹیاں ہیں، اردو اکیڈمی کے ذریعہ بے شمار کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے، دور جدید میں حیدرآباد کی خواتین اردو کے میدان میں نمایاں نظر آرہی ہیں، ان میں سے ایک افسانہ نگار وشاعرہ خاتون کشور سلطانہ ہیں، جن کی اردو ادب کی خدمات نمایاں ہیں، کشور سلطانہ شاعری کی دنیا میں بھی ایک کامیاب خاتون نظر آرہی ہیں۔

مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر ایس اے شکو ڈائیریکٹر سکریٹری اردو اکیڈمی نے ادارہ اقلیم ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام اردو ہال گلشن حبیب حمایت نگر میں منعقدہ تقریب رسم اجرا (خواب محل) میں کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کشور سلطانہ کی کی نظموں کا مجموعہ ''خواب محل'' یہ ان کی شاعری کی پہلی کتاب ہے، جو قابل قدر وقابل مطالعہ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ان خواب محل کا احساس دلایا ہے، جس کا ہر خواتین تصور نہیں کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود جعفری نے کہا کہ ہم پچھلی صدیوں میں تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ پردہ نشین عورت کی کسی مجلس میں رونمائی ہوگی۔ حیدرآباد کے منظر نامے پر کشور سلطانہ کا نام ابھر رہا ہے۔ ان کے جذبات بہت مضبوط اور احساسات بہت بلند ہیں۔ ان کی شاعری میں ظاہری بناوٹ اور غم دوراں وغیرہ نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری فکر وفلسفہ اور بلند سوچ سے عبارت ہے۔ ان کا سفر افسانے سے شروع ہوکر شاعری کے زینے پر آگیا ہے، ان کے استاد محترم حضرت رحمٰن جامی نے ان کے فکر وفن کو نکھارنے میں اہم رول ادا کیا، جس کا اندازہ ''خواب محل'' کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ شفیع اقبال مدیر پروانہ دکن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کشور سلطانہ نصف صدی سے افسانہ نگاری میں مصروف ہیں، ان کو حیدرآباد میں بحیثیت افسانہ نگار سے جانا جاتا ہے، انہوں نے شاعری کی دنیا میں آتے ہی بہت کم مدت میں اتنے اشعار لکھ ڈالے کہ آج ان کی ایک کتاب ''خواب محل'' ہمارے سامنے ہے۔ محمد عبدالرحیم خان نے کہا کہ کشور سلطانہ کی شامل کتاب جملہ نظمیں معیاری ہیں، مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے خواب محل کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

خواجہ کمال الدین مقیم حال امریکہ نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ کشور سلطانہ کوئی نئی شاعرہ نہیں ہیں بلکہ وہ چار دہائی قبل

شاعری کے میدان میں قدم رکھ چکی تھیں۔امریکہ اور ہندوستان کے کئی اہم رسالوں میں ان کے افسانے کے ساتھ نظمیں بھی شائع ہوئی ہیں،جن کو باذوق قارئین نے پسندیدگی کی سند سے نوازا۔جسٹس اسماعیل نے کشور سلطانہ کو مبارک بادی دیتے ہوئے ان کے مجموعہ کلام ''خواب محل'' کے چنندہ اشعار حاضرین کے گوش گزار کیا اور اس کی اہمیت وجامعیت پر تبصرہ کیا۔رحیم رامش نے مختصر ہی سہی مگر جامع بات یہ کہی کہ کشور سلطانہ کی شاعری میں ماضی، حال،مستقبل در مستقبل دیکھا جاسکتا ہے ۔تقریب کے سرپرست استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامؔی نے پہلے مجموعہ کلام کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ کشور سلطانہ کی نظموں میں جگہ جگہ انبساط کی لہریں جلوہ گر ہیں، جو زندگی کو فتح مندی وکامرانی سے جوڑتی ہیں۔یوں کہا جائے کہ ان کی شاعری میں خوشی ہی خوشی ہے،جس کو وہ بکھیر رہی ہیں۔کشور سلطانہ اس مسرت وشادمانی کے موقع پر جذبات سے لبریز ہوکر خود''خواب محل'' کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ محبت کا خواب، حیدرآبادی تہذیب اور قومی یکجہتی کا خواب ہے اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ ہم آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیتے ہوئے چلیں کہ خواب دیکھیں اونچی بلڈنگوں کا نہیں مادی چیزوں کا نہیں بلکہ اپنی تہذیب وثقافت اور قدیم روایت کو زندہ رکھنے کا خواب دیکھیں۔ڈاکٹر مختار احمد فردین نے کشور سلطانہ کو مبارکباد دی اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا حاضرین سے یہ گزارش کی کہ''خواب محل'' کو خرید کر پڑھیں اور خود عملی نمونہ پیش کیا۔(ایک ہزار ایک روپے میں خواب محل خرید کر مختار احمد دفردین نے اردو کے فروغ کے لیے مثال قائم کی)اس رسم رونمائی کے موقع پر نئی نسل کو کتاب خرید کر پڑھنے کی ترغیب دی،انہوں نے مصنفہ کی اردو خدمات کو دیکھ کر اردو رتن ایوارڈ کا اعلان کیا۔یہ ایوارڈ کشور سلطانہ صاحبہ کو جشن حضرت رحمٰن جامی کے موقع پر استاذ الاساتذہ عالمی نامور شاعر حضرت رحمٰن جامؔی کے ہاتھوں کشور سلطانہ کو دیا جائے گا،جس کا سامعین نے خیر مقدم کیا)۔ڈاکٹر مولانا محمد محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر''صدائے شبلی'' نے سبھی مہمان کرام کا ہدیہ گل وشال پوشی سے استقبال کیا۔ڈاکٹر عائشہ صدیقہ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔حافظ وقاری ڈاکٹر نصیرالدین منشاوی نے تلاوت کلام اللہ سے تقریب کا آغاز کیا۔یوسف سعید سردار نے رسالت مآبؐ کی شان میں نذرانہ عقیدت پیش کیا اور آخر میں حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔اس تقریب میں خواتین وحضرات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

ماہنامہ''صدائے شبلی''شمارہ جون ۲۰۱۸ء کا(اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد میں)رسم اجرا کی تصاویر





رحیم رامش،ڈاکٹر سراج احمد انصاری،ڈاکٹر عبدالقدوس،ڈاکٹر عائشہ صدیقہ،استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامؔی،ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر صدائے شبلی،ڈاکٹر مختار احمد فردین،محمد مجیب احمد،یوسف سعید سردار،کشور سلطانہ،ابوہریرہ یوسفی وغیرہ رسم اجرا کرتے ہوئے

حکیم سید شاہ محمد خیر الدین قادری، صوفی (نبیرہ شاہ چراغ دکن)، حیدرآباد

حضرت سید مظاہر الدین شاہ چشتی قادری

سرزمین دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے، یہاں اہل علم کی ہمیشہ پذیرائی کی جاتی رہی ہے اور اسی طرح اللہ کے محبوب بندوں نے بھی اس سرزمین کو فیوض روحانی سے دکن کو منور کیا، انہیں اللہ کے محبوب بندوں میں حضرت سید مظاہر الدین شاہ حسینی چشتی قادری بخاری کی ہے۔ آپ ۹۱۳۷ء مطابق ۱۲۱۰ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے۔ آپ سلسلہ نسب حضرت غوث الاعظم سے جاملتا ہے، آپ اکیسویں پشت میں ہوتے ہیں۔

۱۲؍سال کی عمر میں آپ نے خواب دیکھا کہ حضرت باباشرف الدین سہروردی نے دکن آنے کا حکم دیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت باباشرف الدین سہروردی کو حضورؐ نے خواب میں دکن روانہ ہونے کا حکم دیا تھا، اسی طرح حضرت موصوف کو باباشرف الدین سے حکم حاصل ہوا۔ چنانچہ آپ نے دکن کی جانب سفر اختیار کیا۔ بخارا سے سفر طے کرتے ہوئے دکن میں جلوہ گر ہوئے۔ پہلے آپ نے حضرت باباشرف الدین کی بارگاہ میں حاضری دی، وہاں آپ کو ہدایت دی گئی کہ میرے بھائی باباشرف الدین کی خدمت میں حاضری دو، وہاں تم اپنے مقصد کو پالوگے۔ چنانچہ آپ حضرت کی حذمت میں حاضر ہوئے اور حسب ہدایت آپ مسجد کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں آپ کی خدمت میں بلاتفریق مذہب وملت کے لوگ نے حاضری دینا اپنے لیے رحمت سمجھتے تھے۔ چند ہی عرصے میں ہر طرف آپ کے محبان کا چرچا ہوگیا اور مصیبت زدہ آپ کے در سے فیض پاتے۔

اللہ والوں کی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑے۔ چنانچہ اسی مقصد کے حصول کے لیے اللہ کے بندوں کو قریب کر کے اور اپنی عملی زندگی ان کے سامنے نمونہ پیش کرتے اور اپنے روحانی طاقت سے ان کے قلوب کو پھیر دیتے۔ یہ عمل وکردار ہے جو ہر اللہ کے ولی کا نصب العین تھا اسی وجہ سے ہر مذہب کے لوگ ان کے گرویدہ ہوتے اور وہ دائرہ اس میں پناہ حاصل کر لیتے۔ ہندستان میں انہیں اللہ کے محبوب بندوں کے ذریعہ اسلام پھیلا اور آج مسلمانوں کی تعداد کروڑوں میں ہوگئی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اللہ کے محبوب بندوں کی کاوشوں کو پس پشت ڈال کر آج مسلمان ایک دوسرے کو اسلام سے خارج کرنے کی ناکام کوشش میں دوسروں سے سبقت لے جارہے ہیں۔ جب خود مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر کہنے میں وقت برباد کریں گے تو پھر دیگر قوم کو اسلام کی طرف راغب کون کرے گا۔ آج ہر فرقہ خود کو حق بتانے میں مصروف ہے، اس کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کرے گا کہ کون حق پر ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ہر مسلمان وہ راستہ ہرگز اختیار نہیں کرتا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو پسند نہ ہو۔

حیدرآباد میں گونجی ہے صدائے شبلی
منظرِ عام پہ ہے جس سے نوائے شبلی
اس شمارے کے ہیں رشحات قلم فکر انگیز
جس میں شامل کئی عنواں ہیں برائے شبلی
شبلی کالج کا ہوں پروردہ میں جس سے برقی
سر پہ ہے سایہ فگن میرے ردائے شبلی

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

ابو ہریرہ ایوبی
18 نیوز

فٹ بال فیفا عالمی کپ کا فرانس نیا سکندر بنا

فٹبال فیفا عالمی کپ کا فرانس نیا سکندر بنا ہے۔ فائنل مقابلے میں فرانس نے کروشیا کو شکست دیکر عالمی کپ پر قبضہ جمایا۔اس طرح بیس سال کے انتظار کے بعد فرانس کو پھر فیفا کی سنہری ٹرافی نصیب ہوئی۔اور فرانس نے دوسری مرتبہ فٹبال کے عالمی چیمپیئن بننے کا اعزاز حاصل کرلیا۔اس سے قبل فرانس نے 20 سال پہلے 1998 میں فٹبال کے عالمی فاتح بننے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔۔فائنل مقابلہ یوں تو بہت دلچسپ نہیں رہا، لیکن فٹبال کے شائقین کو گول کے لئے بہت انتظار نہیں کرنا پڑا۔میچ کی شروعات میں ہی فرانس نے پہلا گول داغا۔تو کروشیا نے بھی پلٹ وار کیا۔اور میچ ایک ایک سے برابر کرلیا۔ فائنل میں دونوں ٹیموں کا جنون صاف جھلک رہا تھا۔ کھلاڑیوں میں عالمی فاتح بننے کا جوش نظر آرہا تھا۔ دونوں ہی ٹیمیں پورے ٹورنامنٹ میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کر کے فائنل میں پہنچیں تھیں۔اور فیفا کی ٹرافی سے محض ایک قدم دور۔کروشیا جیسے چھوٹے ملک کے لئے یہ بہت بڑا موقع تھا دنیا کے نقشہ پر چھا جانے کا۔لیکن فائنل مقابلے میں کروشیائی ٹیم میں کم تجربے کی کمی صاف نظر آئی۔اتنے بڑے ٹورنامنٹ کے فائنل کا دباؤ کیسے جھیلا جائے۔شاید یہ چیز کروشیا کے خلاف گئی۔ دوسری طرف فرانس کو ایک بار فٹبال کا عالمی چیمپئن بننے کا تجربہ تھا۔جو اسے یہاں بھی کام آیا۔فائنل مقابلہ بڑا دلچسپ رہا۔ میچ کے پہلے ہاف کی نسبت میچ کے دوسرے ہاف میں فرانسسی ٹیم نے میچ پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور 4-2 سے فتح اپنے نام کی۔فرانس کی ٹیم نے میچ کے شروع میں ہی گول داغا۔نہ تجربہ کار کروشیا پر دباؤ مزید بڑھا دیا۔ دوسرے ہاف میں پال پوگبا نے میچ کے 59ویں منٹ میں ایک نہایت شاندار گول کر کے فرانس کی برتری 3-1 کردی۔اس کے چھ منٹ بعد ایمبا پے نے ایک اور گول کر کے سکور 4-1 کر دیا۔میچ کے 70ویں منٹ میں مینڈزوکچ نے گول کر کے کروشیا کی امیدیں برقرار رکھیں تاہم کروشیا مزید کوئی گول کرنے میں ناکام رہا۔پہلے ہاف کے 38ویں منٹ میں فرانس کو پینلٹی کک ملی جس پر انتوئن گریزمین نے فرانس کو ایک بار پھر سبقت دلا دی۔اس سے قبل پہلے ہاف میں میچ کے 18ویں منٹ میں کروشیا کے ماریومنڈزوکچ کے اون گول کی بدولت فرانس کو برتری حاصل ہوگئی جب فرانسیسی کھلاڑی انتوئن گریزمین کی فری کک سے بال مینڈزوکچ کے سر سے ٹکراتی ہوئی جال میں جا گری۔ یہ ورلڈ کپ کے کسی فائنل میں ہونے والا پہلا اون گول تھا۔تاہم یہ برتری زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور ایوان پریسچ نے 29ویں منٹ میں ڈی کے کونے پر ایک پاس ملنے کے بعد خوبصورت گول کر کے سکور ایک، ایک سے برابر کر دیا۔ پہلے ہاف کے 38ویں منٹ میں فرانس کو پینلٹی کک ملی جس پر انتوئن گریزمین نے فرانس کو ایک بار پھر سبقت دلا دی۔کروشیا کے ایوان پریسچ نے 29ویں منٹ میں فری کک پر ہی ایک خوبصورت گول کر کے سکور ایک، ایک سے برابر کر دیا تھا یاد رہے کہ کروشیا نے پہلے مرتبہ ورلڈ کپ کے فائنل کے لیے کوالیفائی کیا تھا جبکہ تیسری بار ورلڈ کپ فائنل کے لیے کوالیفائی کرنے والی فرانس کی ٹیم

بقیہ، ص:۳۴/ پر

نغماتِ کوثر

تبصرہ نگار: ابوھریرہ یوسفی قاسمی

شاعر: کوثرؔ معروفی

مرتب: اسامہ ارشاد معروفی

صفحات: 150

قیمت:

ملنے کا پتہ: مکتبہ الفہیم صدر چوک مئو (یوپی)

رفیق مکرم جناب مولانا اسامہ ارشاد معروفی کا مرتب کردہ مجموعہ ''نغماتِ کوثر'' کی ورق گردانی کے بعد میرا دل فرحت وشادمانی سے جھوم اٹھا کہ موصوف نے انتہائی تگ ودو اور جانفشانی کے ساتھ ایک گمنام استاد شاعر کے غیر محفوظ کلام کو یکجا کیا اور کتابی شکل دے کر قابل ستائش کوشش کی ہے اور قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے۔ مولانا اسامہ ارشاد نے جناب کوثر معروفی کی نعتوں، غزلوں اور دیگر مختلف منظومات کو ترتیب دے کر ایک گمنام ہستی کے قیمتی سرمایے کو آشکار اور اجاگر کیا ہے۔ جناب کوثرؔ معروفی صاحب کے منظومات کی ترتیب یقیناً ایک محنت طلب کام تھا، اس لئے کہ محترم شاعر نے اپنی 56 سالہ شاعری کی طویل مدت میں اپنا کوئی کلام خود سے کسی کاپی میں جمع نہیں کیا، اور نا ہی کسی اخبار ورسالے میں شائع کرایا ہے، حالانکہ شاعر نے اپنی چوبیس سالہ زندگی سے لے کر اب تک ہزاروں غزلیں، سیکڑوں نعتیں، ان گنت نظمیں اور حمد، گیت، سہرے، قصیدے مرثیے، قطعات لکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے، اگر وہ سب جمع ہوتے تو کئی دیوان تیار ہوجاتے۔ اور اب تک متعدد ضخیم مجموعات منظر عام پر آجاتے، لیکن ایسا نہ ہوسکا، تاہم مولانا اسامہ ارشاد نے 150 صفحہ پر مشتمل کوثر معروفی کے بحرِ کلام سے بڑی جدوجہد کے بعد ادھر ادھر سے چند قطرے چن چن کر نغمات کوثر جیسی شاہکار کتاب کو وجود دیا، جس میں انہوں نے کوثر معروفی کے شاعری جو کہ مختلف صنفوں میں تھیں ان میں سے انتخاب کر کے جمع کردیا ہے۔



بہرکیف کوثر معروفی صاحب میرے پڑوسی شاعر ہیں، جب اپنے غریب خانے پر رہتا ہوں تو اکثر وبیشتر محترم شاعر سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے، اس دوران ان کے برجستہ شاعرانہ کلام سے بھی محظوظ ہوتا ہوں، ان کو برجستہ کلام پر زبردست فوقیت حاصل ہے، جب وہ غزل وغیرہ سناتے ہیں تو مجھے ان کے کلام میں شاعر مشرق علامہ اقبال نظر آتے ہیں۔ اگر کوثرؔ صاحب اپنا کلام لکھ کر جمع کرنے اور رسائل وجرائد میں شائع کرانے کا اہتمام اور قدر کیئے ہوتے ہوتے تو یقیناً آج وہ ملک گیر شہرت کے حامل صف اول کے شاعر تسلیم کیئے جاتے، لیکن انہوں نے ہمیشہ شہرت اور نام ونمود سے خود کو استثناء رکھا اور ان کو اخبار ورسائل میں اپنی تخلیقات کی اشاعت اور مشاعروں میں شرکت سے عدم دلچسپی رہی، جس کی وجہ سے وہ ایک غیر معروف اور گمنام شاعر تصور کیئے جاتے ہیں، اگر وہ اپنے جملہ کلام کو محفوظ کیئے ہوتے تو آج وہ شاعری کے آسمان پر سورج کی مانند روشن اور تابناک سمجھے جاتے۔

کوثرؔ معروفی صاحب کی شاعری ترجمانِ فطرت ہے، درحقیقت وہ غزل گو شاعر ہیں، لیکن انہوں نے شاعری کے ہر صنف میں بھرپور طبع آزمائی کی ہے، ان کی دلچسپی اور بے انتہا صلاحیت غزل میں زیادہ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی رقم طراز ہیں:

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

''کوثر معروفی ایک پرگو بسیار نویس اور ہمہ جہت شاعر ہیں، یوں تو انہوں نے تقریباً تمام مروجہ اصناف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل کو وہ اور ان کو غزل کچھ زیادہ ہی راس آگئی، اس لئے ان کے فکر وفن کا اصل جوہر بھی ان کی غزلوں میں ہی کھلتا ہے''۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''کوثر معروفی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں، وہ چاہے جس صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہوں، غزل کے اثرات سے خود کو الگ نہیں کر پاتے۔''

بہرحال کوثر معروفی عہد حاضر کے ایک مایہ ناز اور بلند پائے کے شاعر ہیں۔ قابل مبارکباد ہیں مولانا اسامہ ارشاد صاحب، جو انہوں نے کوثر معروفی کی نظموں کا ایک مختصر ہی سہی مجموعہ ترتیب دے کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

نغمات کوثر دلکش ٹائٹل کے درمیان ہے، شروع میں شاعر کی حالات زندگی پر ادباء وعلماء نے بالتفصیل روشنی ڈالی ہے، پوری کتاب غزل، حمد، نعت، قطعہ اور دیگر منظومات پر مشتمل ہے۔

بقیہ، ص:۲۶/ پر

Mohammed Abdul Khader Cell : 9392492002
: 9885959976
HUSSAIN
KIRANA STORE
WHOLESALE & RETAIL
Specialist in : All Kinds of Catering Suppliers
22-3-480/482, Clock Tower Main Road,

حسین کیرانہ اسٹور ہول سیل اینڈ ریٹیل
H.K. Caterers
مین روڈ میر عالم منڈی حیدرآباد

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India
website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's
یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE



Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colon
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

LUCKY
NUTRITION SHOP
Contact
9966762525



CAPTAIN ARSHAD
MR. INDIA & 7 TIMES A.P. CHAMPION
Cell : 9966762525



Founder of :
Lucky Gym
Complete Body Building & Fitness Centre